فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ (القرآن)

آپ بیتی

رسالہ

سوانح

برکۃ العصر، شیخ الحدیث، قطب العالم

حضرت مولانا محمد زکریا الکاندھلوی

ثم المہاجر المدنی قدس سرہ

۱

ناشر مکتبہ عمر فاروق
4/501 شاہ فیصل کالونی کراچی

فہرست مضامین آپ بیتی نمبر ۱

مضامین	صفحہ
تمہید	۱۷
تنقید بر سوانح یوسفی	۱۹
والد صاحب کا امتحان اور میرا جواب	۲۶
انوکھی تربیت	۲۶
تربیت کے سلسلے میں (۹) واقعات	۲۷
ایک اہم واقعہ	۳۳
اچھے کپڑوں سے نفرت	۳۵
کرنل اقبال کا ساٹھ روپے گز کا جوڑا سلوانا	۳۵
جہیز میں کیا دیا جائے	۳۶
والد صاحب عرزِ تعلم دسواں واقعہ	۳۷
گیارہواں واقعہ	۳۸
حضرت شاہ عبدالرحیم کا مشہور مقولہ	۴۰
حضرت اقدس مولانا الحاج احمد علی صاحب کا کمال تقویٰ	۴۰
حضرت سہانپوری کا تنخواہ سے انکار	۴۲
مدرسہ کی اشیاء ذاتی استعمال کیلئے نہیں	۴۲
مہتمم نور مدرسین مظاہر جلسہ کے موقع پر بھی اپنے گھر سے کھانا کھاتے	۴۲
حضرت مولانا عنایت الٰہی کے دو قلمدان اور پینشن کا واقعہ	۴۳
حضرت سہانپوری کے اسباق کی نگرانی	۴۴
اخبار بینی سے نفرت	۴۶
صاحب کے طالب علمی کے واقعات	۴۶
لکھنے کا واقعہ حضرت حاجی صاحب کا	۴۸
حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کا	۴۹
طالب علمی کے زمانے میں صرف روٹی بغیر سالن کے کھانے	

فہرست مضامین آپ بیتی نمبر ۲

مضامین	صفحہ
بابِ اول	۵۴
اعمال کا مدار نیتوں پر ہے	۵۴
حضرت مولانا حبیب صاحب کا سوال اور بندہ کا جواب حقیقت تصوف کے بارے میں	۵۷
ہر نیکی صدقہ ہے بیوی سے صحبت بھی صدقہ ہے	۶۵
آخر میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا تعلق اور تربیت صاحبزادگان کی درخواست	۶۶
مولوی انیس الرحمٰن و مولوی عبد الجلیل صاحبان کا ذکرِ جمیل	۶۷
بابِ دوم	۶۸
درس و تدریس اور مظاہر علوم و تالیفات	۶۸
رمضان المبارک میں قرآن کا ابتدائی معمول	۷۴
بندہ کی ابتدائی فارسی	۷۶
گنگوہ سے سہارنپور میں آمد	۷۷

مضامین	صفحہ
والد صاحب کا طرزِ تعلم	۷۸
وہ نقشیہ یہ ہے	۷۹
مولانا ماجد علی صاحب اُستاد منطق	۸۲
میری منطق کا سال	۸۳
اساتذہ کرام کے احوال	۸۵
ایک عجیب قصہ یا خواب	۹۰
ابتداء مشکوٰۃ	۹۱
دورہ کا سال	۹۲
میرے والد صاحب کی تدریس بخاری	۹۳
حدیث کی سبق میں وضو کا اہتمام	۹۴
حضرت سے دوبارہ احادیث پڑھنا	۹۵
ابتداء تالیف بذل المجہود	۹۷
تیسرا دور شروع ہوا	۹۲۸
طحاوی سے میرے والد اور انور کشمیریؒ کا شعف	۹۹
اب مدرسی کی سنو	۱۰۰
کُتب زیرِ تدریس زکریا عُفی عَنہ	۱۰۳

سبعہ معلقہ کا سبق	۱۰۷
مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۱۰۸
تقسیم جائیداد میں بڈھانہ کا سفر	۱۱۲
اسٹرائک کی لعنت مدرسے میں نہیں تھی	۱۱۸
مدرسین کا مدرسہ کی خدمت	۱۱۹
بندہ کی مشیر ناظم کی تجویز	۱۲۴
اخبار مدینہ کا غلط الزام	۱۲۸
تالیفات	۱۳۵

نَحمَدُہ وَنصَلّیُ عَلیٰ رَسُولِہ الکَرِیم

یہ کوئی مستقل رسالہ ہے اور نہ کوئی مستقل مضمون

جب عزیزی مولوی محمد ثانی سلمہ نے عزیزم مولانا محمد یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ ورحمۃ اللہ کی سوانح شائع کی تو اپنی محبت اور علی میاں کی شفقت کی وجہ سے اس کا باب اول اس ناکارہ کے متعلق تھا وہ علی میاں سے لکھوایا، جس پر میں نے ذیل کا خط عزیز محمد ثانی کو لکھا تھا کہ جو باتیں لکھنے کی تھیں وہ چھوڑ دیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں۔ جب رسالہ اسٹرائک طباعت کے واسطے دیا تو مجھے خیال ہوا کہ طلباء پر تنبیہات کے ساتھ یہ ناکارہ مثال کے طور پر ان تنبیہات کی بھی ذکر کردے جو اس ناکارہ پر میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی طرف سے ہوئیں تاکہ طلباء کو یہ بھی معلوم ہوجائے کہ ان ناکارہ کے خیالات میں جو جمود اور تنگ نظری ہے وہ بڑی تنبیہات کے بعد پیدا ہوئی اور دوسروں کے عیوب کے ساتھ اپنے عیوب بھی ظاہر کردوں تاکہ اعتدال پیدا ہوجائے۔

میں ہی کرتا ہوں گلہ اپنا، نہ سن غیروں کی بات
وہ یہی آخر کہیں گے، اور کیا کہنے کو ہیں

فقط

زکریا

تنقید بر سوانح یوسفی

صلاح کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

عزیز گرامی قدر منزلت! عافاکم اللہ وسلم، بعد سلام مسنون تمہاری کتاب سے بہت ہی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے دونوں جہاں میں بہترین جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کے منافع دینی ودنیوی سے بھرپور متمتع فرمائے۔ امید سے زیادہ بہتر لکھی اگرچہ اس کے بہت سے اجزاء متفرق میں سن چکا تھا لیکن مسلسل سننے میں جو لطف آیا وہ پہلے ہی نہیں آیا تھا کاش میری آنکھیں قابل نظر ہوتیں تو ایک دو شب ہی میں نمٹا دیتا۔ مجھے اکابر کی سوانح پڑھنے کا ساری عمر سے شوق ہے۔ شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، دن میں تو کبھی فرصت نہیں ملی، عشاء کے بعد ضروری مطالعہ سے فراغت کے بعد شروع کیا کرتا تھا اور اکثر صبح بھی کر دی اس لئے کہ مجھے شباب کے زمانہ میں تمام رات جاگنا بہت آسان تھا۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ اکثر اخیر شب میں تشریف لاتے، تین چار بجے پہنچتے اور تشریف آوری کے تار کا بہت اہتمام تھا۔ اور چونکہ ایک عیب مجھ میں رہ رہا ہے کہ سو کر اٹھنا میرے بس کا نہیں تھا، اس لئے عشاء کے بعد سے اپنا کام شروع کر دیتا تھا اور دو تین بجے پاپیادہ ریل پر پہنچ جاتا تھا کہ میں معذوری سے پہلے کبھی ریل پر سواری میں نہیں گیا، اسی بناء پر اکابر کی سوانح ہمیشہ ایک شب یا دو شب میں پوری کی، حضرت گنگوہی، حضرت سہارنپوری، حضرت شیخ الہند، حضرت تھانوی، حضرت مدنی اور حضرت سید صاحب، چچا جان وغیرہم نور اللہ مراقدہم کی سوانح اور مکاتیب اسی ذوق وشوق سے پورے کئے لیکن اب آنکھوں کی معذوری نے دوسرے کا محتاج بنا دیا اور دوسروں کے لئے۔

وصل ہو یا فراق ہو غالبؔ ☆ جاگنا ساری رات مشکل ہے

کی بناء پر مہمانوں سے فراغ کے بعد ایک دو گھنٹہ ہوتا رہا۔ اس لئے کئی شب لگ گئیں۔ ایک باب کے سوا جو تم نے علی میاں سے لکھوایا ساری کتاب میں بہت لطف آیا۔ البتہ یہ باب تم نے گلاب کی حوض میں ایک بوتل پیشاب کی ڈال کر یا مہذب الفاظ میں نہایت نفیس مخمل میں پرانے ٹاٹ کا پیوند لگا کر کتاب کو بدنما کر دیا۔ اس کے باوجود اس باب میں بہت سی خامیاں رہ گئیں۔ اگر میں اس کا مسوّدہ پہلے سن لیتا تو بہت سی اصلاحیں کراتا۔ جو باتیں نہ لکھنے کی تھیں ان میں اِطناب مخل کر دیا اور جو لکھنے کی تھیں ان میں ایجازِ مخل کر دیا۔

''۲دو نازک امتحان وتوفیق الٰہی'' کے لکھنے میں مجھے کوئی بار نہیں، محض اس وجہ سے

کہ شاید کسی اللہ کے بندے کو اس نوع کی توفیق نصیب ہو جائے لیکن علی میاں نے صرف دو لکھے اور وہ بھی بہت مجمل[1] اور اس سے زائد کی نفی بھی فرمادی۔

---

[1] پہلے خیال تھا کہ میرا یہ خط سوانح یوسفی کے ساتھ شائع ہوگا، اس لئے میں نے ان دونوں امتحانات کو مجمل ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب جب کہ یہ مستقل شائع ہو رہا ہے اس لئے خیال ہوا کہ اس کو مفصل لکھ دوں، میں نے یہ واقعہ تفصیل سے لکھوایا تھا۔ لیکن لکھوانے کے بعد میرے کاتب عزیز مولوی شاہد سلمہٗ نے بتایا کہ یہ تو آپ بیتی میں آچکا ہے بڑا قلق ہوا کہ لکھوانے میں بڑا وقت خرچ ہوا تھا۔ یہ واقعات تفصیل سے آپ بیتی جلد دوم میں بعنوان علی گڑھ کی ملازمت کی تجویز میں لکھا جا چکا ہے۔

دوسرا واقعہ جس کو علی میاں نے مختصراً لکھا ہے میں تو اس کو بھی مفصل لکھوا رہا تھا کیونکہ مجھ کو ضعف و پیری اور میرے حافظہ کی وجہ سے یہ یاد نہیں رہتا کہ کون سا واقعہ کہاں لکھا گیا، لیکن عزیز موصوف نے بتایا کہ یہ واقعہ بھی آپ بیتی میں گزر چکا ہے، مگر اس وقت متعدد احباب کے تلاش کرنے کے نہیں ملا، اسلئے اس واقعہ کو عزیز مولوی یوسف مرحوم کی سوانح سے نقل کرا رہا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ نقل کراؤں اور پھر وہ کہیں مطبوعہ مل جائے..... علی میاں کہتے ہیں:

اس (علی گڑھ کے واقعہ) سے بڑا امتحان چند دنوں کے بعد پیش آیا۔

کرنال میں نواب عظمت علی خاں مظفر نگر کے مشہور وقف کی جانب سے ایک بڑا تبلیغی دار العلوم قائم کیا گیا۔ جسکی خصوصی غرض و غایت یہ تھی کہ اسلام کی تبلیغ اور اس کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے نیز جدید شبہات اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے جو اس وقت اپنی تبلیغی کوششوں میں بہت سرگرم تھے، ایسے فضلاء تیار کئے جائیں جو عربی و انگریزی دونوں سے واقف ہوں اور علوم قدیم و جدید دونوں کے جامع ہوں۔ اس کے لئے یہ تجویز ہوئی کہ بڑے وظائف و دیگر مستند عربی مدارس کے فضلاء کو انگریزی اور کالجوں و یونیورسٹیوں کے فارغین کو عربی پڑھائی جائے۔ مولانا سر رحیم بخش صاحب مرحوم جو ریاست بہاولپور کے صدر کونسل اور ایجنٹ تھے اس تحریک کے بڑے سرپرستوں میں سے تھے۔ ان کا تعلق گنگوہ رائے پور اور سہانپور سے خادمانہ اور مخلصانہ تھا اور وہ مظاہر علوم کے بھی سرپرستوں میں سے تھے۔ انہوں نے ابتدائی مدرس حدیث کے لئے شیخ کا انتخاب کیا اور اس کے لئے سہانپور کا مستقل سفر کیا، ضابطہ کی تین سو ماہوار تنخواہ کے علاوہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کا وعدہ فرمایا۔ مثلاً رمضان کی چھٹی (اور) حضرت کی خدمت میں رہنے کے لئے ہر سال تین ماہ کی چھٹی بلا وضع تنخواہ، اجناس کی سہولت، ان سب کے ساتھ ساتھ ان کی صرف ایک شرط یہ تھی کہ حضرت پر یہ ظاہر نہ ہو کہ یہ

حالانکہ اس نوع کے وقائع بہت کثرت سے پیش آئے اور مجھے تعجب ہے کہ اس قسم کے واقعات تو تذکروں میں علی میاں کے سامنے متعدد بار آئے ہوں گے۔ ان میں کا سب سے پہلا واقعہ جو میری عمر اور حالات کے اعتبار سے زیادہ اہم تھا، وہ تھا جو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے انتقال سے تیسرے دن پیش آ گیا۔ بڑے حضرت اقدس رائے پوری شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو اس سیاہ کار کے ساتھ جو محبت تھی، وہ اسی کا عکس اور آئینہ تھا جس کو حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے شیخ کے اتباع میں پورا فرمایا وہ سب تو

حاشیہ گزشتہ صفحہ سے مسلسل

مدرسہ کے مدرس کو کسی اور جگہ کے لئے آمادہ کریں، انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دو سال کی چھٹی لے لو اور یہ کہو کہ قرض کا بار زیادہ ہے، شادی بھی ہو چکی ہے اور بچے بھی ہیں، مدرسہ کی تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا، اس وقت شیخ کی تنخواہ بیس روپے تک پہنچی تھی، مولانا مسرر رحیم بخش صاحب کے دیرینہ تعلقات ان کی بزرگانہ، مخدومانہ حیثیت ان کا پرخلوص اصرار، قرض کا بار، تنخواہ کی قلت اور ترقی کے امکانات کا فقدان یہ سب وہ حقائق تھے جو اس پیش کش کو قبول کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے اور ان کے لئے شرعی اخلاقی علمی دلائل بھی پیش کرتے تھے۔ یہ ایک نوجوان عالم کے لئے جو ذہانت کے جوہر سے آراستہ اور حدیث وادب میں شہرت یافتہ تھا ایک بڑی آزمائش تھی۔ شیخ اس وقت حقیقۃً ایک دوراہے پر کھڑے تھے، اگر وہ اثبات میں فیصلہ کرتے تو ان کی زندگی کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا اور آج شاید ان سطور کے لکھنے کی نوبت نہ آتی کہ عرصہ ہوا وہ اسکیم فیل ہو چکی، مدرسہ کا نام ونشان باقی نہیں رہا، اس کے لائق مدرسین کچھ تو پیوند خاک ہو گئے اور کچھ گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں، نظر بہ اسباب ظاہر شیخ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف نہ ہوتا، لیکن توفیق الٰہی نے دستگیری فرمائی اور جس کو شیخ الحدیث کے لقب سے مقبول خاص وعام ہونا تھا اور جس سے خدا کو حدیث کی خدمت طلبائے علوم دینیہ کی تربیت اور ایک عالمگیر دینی تحریک (تبلیغ) کی سرپرستی اور مشائخ عصر کی جانشینی کا اہم کام لینا تھا اس کو اس معاملہ میں صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی گئی۔ شیخ کے الفاظ میں سنئے، فرماتے ہیں:

"اس ناکارہ نے مولانا مرحوم سے کہا کہ آپ کے احسانات مجھ پر بہت زیادہ ہیں ان احسانات کے مقابلے میں مجھے آپ سے معذرت کرنی نہایت ہی نامناسب ہے لیکن ان سب کے باوجود تو مجھ سے یہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت سے اجازت لوں لیکن آپ کے براہِ راست کہنے پر اگر حضرت مجھے حکم بھی فرمائیں تو میں عرض کروں گا کہ اس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں۔" عزیمت کا یہ جواب سن کر مولانا رحیم بخش صاحب جو بڑے جوہر شناس اور جہاں دیدہ تھے کبیدہ خاطر نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے جواب کی بڑی قدر کی اور فرمایا کہ میں تمہارا معتقد تو پہلے سے تھا لیکن اس جواب سے میں اور زیادہ معتقد ہو گیا۔

آپ کے سامنے ہے۔ یہ درحقیقت حضرت رائے پوری ثانی کا اپنے شیخ کا کمال اتباع تھا۔ میرے والد صاحب قدس سرہٗ سے بڑے حضرت رائے پوری کو اس سے بھی زیادہ تعلق تھا۔ میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد میری ابتداء یتیمی میں وہ دلداریاں اور شفقتیں فرمائی ہیں ان کی تفاصیل تمہاری پوری سوانح یوسفی بن سکتی ہے۔ میرے والد صاحب کے انتقال سے دوسرے ہی دن میرے بچپن اور والد صاحب کے بارقرض والد صاحب کے انتقال سے دوسرے ہی دن میرے بچپن اور والد صاحب کے بارِ قرض کی بناء پر حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب نے یہ ارشاد فرمایا کہ امور بالا بہت قابل فکر ہیں تم ابھی بچے ہو، تجارت سے واقفیت نہیں، مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کو تجارت میں بہت مہارت ہے اور حضرت نے صحیح فرمایا کہ مولانا مرحوم کو اس لائن میں بہت مہارت تھی اس لئے تم اپنا کتب خانہ لے کر میرٹھ منتقل ہو جاؤ اور مولانا عاشق الٰہی صاحب کی زیرنگرانی تجارت کرو تو انشاء اللہ قرضہ بھی جلدی ادا ہو جائے گا اور متعلقین کی کفالت کا انتظام بھی سہولت سے ہو جائے گا۔ حضرت قدس سرہٗ نے بہت ہی شفقت اور طویل تقریر سے یہ مضمون ارشاد فرمایا جس کو میں نے مختصر نقل کیا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت میرے پاؤں کے نیچے کی زمین نکل گئی۔ میں نے آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ حضرت اگر یہ حکم ہے تو سر آنکھوں پر، اور اگر یہ مشورہ ہے تو میری تمنا تو یہ ہے کہ حضرت سہارنپوری تو انشاء اللہ تشریف لے ہی آئیں گے۔ (حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ اس وقت نینی تال جیل میں بمد تفتیش محبوس تھے جس کا قصہ تذکرۃ الخلیل میں مفصل موجود ہے)۔ میری تمنا ہے کہ حضرت سہارنپوری کی زندگی میں کسی دوسری جگہ نہ جاؤں۔ حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ نے میرا جواب سن کر فرمایا کہ بس بس! اور انتہائی مسرت اور انتہائی اخلاص کیساتھ مجھے اس قدر دعائیں دیں کہ آج بھی وہ دعائیں میرے لئے انتہائی موجب لذت ہیں اور ان کی برکات ہر وقت محسوس کرتا ہوں اور ارشاد فرمایا کہ میری بھی یہی خواہش تھی۔ مگر مولانا عاشق الٰہی صاحب نے بہت اصرار کیا تھا کہ زکریا میرے کہنے کو مانتا نہیں آپ اس کو حکم فرمائیں کہ وہ میرٹھ منتقل ہو جائے اور جو وجوہ مولانا نے بتلائی تھیں وہ ظاہر تھیں، اس لئے میں نے مشورہ دیا تھا۔ یہ جواب سن کر اللہ مجھے معاف کرے مجھے مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ پر اتنا غصہ آیا کہ حد نہیں۔ اگرچہ مولانا میرٹھی نے ازراہِ شفقت فرمایا تھا۔ مگر میری حماقت کہ تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے مولانا کی شفقت کا بدلہ بہت ہی گرانی کے ساتھ دیا۔ اگر اس وقت کوئی لفظ گستاخی کا مولانا مرحوم کی شان میں نکل گیا تو اللہ ہی معاف فرمائے اور مولانا کو اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

دوسرا[1] تیسرا اِبتِلاء وہی ہے جس کو علی میاں نے تحریر فرمایا، گو بہت مختصر لکھا، بہر حال صحیح لکھا۔

چوتھا اِبتِلاء۔ وہ اس ناکارہ کے سفر حج سے واپسی کے تین چار سال بعد جن کی تاریخیں تو صحیح مل ہی جائیں گی کہ وہ خطوط میرے کباڑ خانہ میں کسی بستہ کے اندر ضرور موجود ہوں گے، یہ پیش آیا کہ سفر حج سے واپسی، ۴۶ھ سے، دورہ شریف کے اسباق مستقل میرے یہاں ہونے لگے اور چونکہ والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں ابوداؤد کا سبق مستقل اور مسلسل رہا اور پھر "بذل" میں اس ناکارہ کا اشتغال بھی مسلسل اسی کے ساتھ رہا اس لئے یہ کتاب تو ۷۳ھ جب تک حضرت مولانا عبداللطیف صاحبؒ سابق ناظم کا انتقال نہیں ہوا، مسلسل اور مستقل میرے ہی پاس رہی، اس کے علاوہ دوسری کتابیں نسائی شریف، بخاری شریف جلد اول وغیرہ بھی ہوتی رہیں۔ لیکن ابوداؤد شریف کو اہلِ مدرسہ نے ہمیشہ میری ہی سمجھا اور میں نے بھی اس کو ہمیشہ اپنی ہی سمجھا اسلئے جو طلبہ ابوداؤد پڑھ کر جاتے تھے وہ اپنی محبت سے اس کے ذکر، تذکرہ اور جیسا کہ لوگوں کی عادت ہے اِطراء المَادِح کے ساتھ کرتے رہا کرتے تھے۔ ان ہی مَادِحِین میں سے میرے مخلص دوست مولوی عادلِ قدوسی گنگوہی بھی تھے جنہوں نے ۴۲ھ میں دورہ سے فراغت حاصل کی، یہ تو مجھے یاد نہیں کہ حدیث کی کیا کتاب مجھ سے پڑھی، لیکن یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ دائرۃ المعارف حیدرآباد میں تصحیح کے کام پر ملازم ہوگئے اور وہاں کے مطبع کے اکابر میں وہ اونچی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، انہوں نے نہ معلوم اہلِ مطبع کو کیا جھوٹی سچی باتیں سنائی کہ دو تین سال بعد ان کا ایک بہت ہی طویل خط یاد پڑتا ہے کہ سات آٹھ ورک کا بہت ہی دل لبھانے ولا پہنچا، جس میں لکھا تھا کہ دائرہ میں بیہقی کے اَسمَاءِ رِجَال کی تالیف کا مشورہ طے ہوا اور یہاں مجلس نے دو آدمیوں کا انتخاب کیا ہے، حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کا اور تیرا۔ اور ان دو میں بھی تجھے ترجیح ہے، اس لئے کہ کام بہت لمبا ہے اور حضرت شاہ صاحب کی مشیخت وضعف و پیری اور تیرے شباب و جوانی کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے زمانہ میں پوری نہ ہو سکے۔ تنخواہ آٹھ سو روپے اور ایک موٹر تیرے استعمال کے لئے سرکاری، جس کا پیٹرول اور ڈرائیور کی تنخواہ وغیرہ جملہ چیزیں سرکاری ہوں گی تا کہ تو جہاں جس وقت جانا چاہے جا سکے، مکان بھی سرکاری ہوگا۔ ان میں تو کوئی چیز اللہ کے احسان سے دل لبھانے والی نہیں تھی، جس کو میں نے لبھانا لکھا وہ یہ تھی دائرہ کی ملازمت صرف چار گھنٹہ ہوگی، باقی میں تو مختار ہوگا کہ جو چاہے کرے، دائرہ کے کتب خانے پر تو تیرا اختیار ہو ہی ہوگا کہ جس وقت چاہے تو

---

[1] یہ دوسرا واقعہ علی گڑھ کا اور تیسرا کرنال کا ہے۔

آئے اور جس وقت چاہے لکھے، کتب خانہ آصفیہ کے اوپر تجھے یہ اختیار ہوگا کہ جتنی دیر چاہے بیٹھ کر کتابیں دیکھے اور جو چاہے کتابیں منگالے، اور تو چونکہ ''اَوْجَزُ الْمَسَالِک'' لکھ رہا ہے اسلئے اس کی تالیف میں جتنی آسانی یہاں ہوسکتی ہے وہ مظاہر علوم میں نہیں، اور دائرہ تجھ سے جو کام لینا چاہتا ہے وہ بھی علم حدیث کا ہی ہے، اور بہت ہی اَوْجَزُ کی تالیف کی سہولتیں لکھی تھیں۔ جس کے جواب میں اس ناکارہ نے صرف ایک کارڈ لکھا تھا کہ جس میں نہ القاب نہ آداب

''مجھ کو جینا ہی نہیں بندۂ احساں ہوکر''

فقط زکریا

صرف یہ مصرعہ لکھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ عزیز کا خط آیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، اس نے بہت ہی شفقت ومحبت سے لکھا تھا کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر۔ ''اَوْجُزْ'' کی تالیف جتنی بہتر یہاں ہوسکتی ہے سہارنپور میں نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس وقت تو مجھ پر ملازمت سے وحشت کا ایسا اثر مسلط تھا کہ نظر ثانی کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ مگر بعد میں کبھی کبھی اس ابتلاء کے متعلق اب تک یہ خیال آتا رہتا ہے کہ معلوم نہیں میں نے اچھا کیا یا برا کیا۔ اس زمانہ میں ملازمت سے طبعیت کو وحشت ہی بہت تھی، لیکن اوجز کی تالیف میں بہت سی سہولتیں اور مواد ملتا۔

اس کے بعد پانچواں ابتلاء تقسیم ہند سے دو تین سال پہلے پیش آیا۔ وہ یہ کہ اسی ابوداؤد شریف کی برکت سے بنگالی طلباء (جن کی تقسیم ہند سے پہلے تک بہت ہی کثرت سے آمد تھی، ان میں سے اب بھی مشرقی پاکستان کے مدارس میں صدر مدرس یا شیخ الحدیث ہیں) نے نہ معلوم کیا کیا کہا اور کس کس سے کہا۔ وہاں سے چاٹگام یا ڈھاکہ کے مدرسہ عالیہ کے منتظمین کا ایک بہت لمبا خط آیا۔ نام میں اس وقت تردد ہے جس میں وہاں کی مشیخت حدیث کے لئے اور صرف ترمذی، بخاری شریف پڑھانے کے لئے بارہ سو روپے تنخواہ پر اس ناکارہ کو بہت ہی اصرار سے بلایا تھا اور ایک تار ارجنٹ اس مضمون کا کہ خط کے جواب کا شدت سے انتظار ہے، مگر اس وقت تک خط نہیں پہنچا تھا اور دو روز بعد دوسرا ارجنٹ جوابی تار ''خط کے جواب کا سخت انتظار ہے'' ملا۔ اس وقت خط پہنچ چکا تھا۔ تار کا جواب تو میں نے صرف یہ لکھ کر کہ ''معذوری ہے''۔ مفصل خط میں ان کو میں نے لکھا کہ ''جن دوستوں نے آپ سے میرا نام لیا ہے انہوں نے محض حسن ظن سے غلط روایت پہنچائی ہیں، یہ ناکارہ نہ اس کا اہل ہے اور نہ متحمل''۔

اس کے بعد البتہ اللہ کا احسان ہے کہ پھر کوئی واقعہ اس قسم کا پیش نہیں آیا اور بجز

حیدرآباد والے واقعہ کے، اور سب پر اللہ کا بہت ہی شکر ادا کیا کہ اللہ نے بہت ہی کرم واحسان فرمایا۔ اگر ان میں سے کسی ایک میں پھنس جاتا تو صورۃ جو ایک ڈھونگ بنا رکھا ہے یہ بھی نہ رہتا۔

البتہ حیدرآباد والے واقعہ میں یہ ضرور خیال آتا ہے کہ شاید "لا مِع" "اَوْجَز" خوب اچھی لکھی جاتی۔ اور چونکہ مدرسہ کا قصہ بھی نہ ہوتا اس لئے فراغت بھی خوب ملتی اور جلدی لکھی جاتی۔ لکِنّ الْخَیْرَ فِیْمَا وَقَعَ.

یہ چند واقعات اس زمانے کے ہیں جب عُرفاً شعور کا زمانہ سمجھا جاتا تھا۔ حقیقی شعور تو اب تک بھی نصیب نہیں ہوا لیکن جو زمانہ عرفی بے شعوری کا تھا اور اگر یوں کہوں کہ ابتدائی اِبْتِلاء تھا تو بے محل نہ ہوگا۔ مرزا ثریا جاہ مرحوم کا ذکر تو میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور عزیز مولوی یوسف مرحوم کی سوانحوں میں کثرت سے گزر چکا، ان کو میرے دادا صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بہت ہی عقیدت اور محبت تھی انہوں نے میرے دادا نور اللہ مرقدہٗ سے باصرار یہ خواہش اور تقاضا کیا کہ میں اپنی عمر کی قیصر جہاں بیگم کا نکاح عزیز مولوی محمد یحییٰ صاحب سلمہٗ سے کرنا چاہتا ہوں، دادا صاحب پسند تو نہ کرتے تھے مگر مرزا صاحب کے شدید اصرار پر انہوں نے میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے اِسْتِمْزَاج کیا، والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے معذرت کر دی، جس کا صاحبزادی مرحومہ کو بھی بہت قلق تھا۔ مگر اس خاندان سے میرے والد صاحب اور چچا جان نور اللہ مرقدہما اور اس ناکارہ کے بھی ابتدائی دور میں ایسے تعلقات وابستہ تھے جیسے گھر والوں کے ہوتے ہیں۔ میرے والد صاحب اور چچا جان نور اللہ مرقدہما کی کثرت سے آمد و رفت قیصر جہاں مرحومہ کے مکان میں ہوتی تھی۔ جب کبھی میرا جانا ہوتا تو مرحومہ باوجود اپنی انتہائی نفاست، نزاکت کے مجھے۔ اپنے پاس سلایا کرتیں اور بہت لپٹ کر سویا کرتی تھیں، میری عمر اس وقت ۶، ۷ سال کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے۔ مرحومہ نے کئی مرتبہ میرے سامنے والد صاحب سے اصرار کیا کہ مجھے تو آپ نے قبول نہ کیا مگر زکریا میرا بچہ ہے میں اس کو اپنا بیٹا بناؤں گی، اپنے پاس رکھوں گی اور اپنی لڑکی سے اس کا نکاح کروں گی۔ والد صاحب کا جواب تو ہوتا تھا کہ جس چیز کو میں نے اپنے لئے پسند نہ کیا اس کے لئے کیسے پسند کروں؟ مگر ان کا شدید اصرار از خود رفتہ تھا کی بناء پر ایک مرتبہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے امتحاناً مجھ سے دریافت فرمایا، میں نے عرض کیا کہ "پاندان لئے لئے پھرنا میرے بس کا نہیں"۔ اس کی شرح یہ ہے کہ مرحومہ کے شوہر مرزا محمد شاہ کو مرحومہ سے عشق تھا، وہ نہایت نفیس مسہری پر بیٹھی رہتی تھیں اور مرزا شاہ مرحوم پاندان ان کے پاس لا کر رکھتے اور یہ کہتے تھے کہ "بیگم ایک پان کھلا دو"۔ مجھے یہ چیز اس قدر ناگوار ہوتی کہ اپنے خاندان کے بالکل ضد، ہمارے گھر کا تعامل بیوی

گویا محکومہ خادمہ ہے۔ خاوند کا منصب ہے بیوی سے یہ کہے کہ ایک پان بنالا۔

والد صاحب کا امتحان اور میرا جواب

میرے اس جواب پر والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے خود اپنا قصہ مجھے سنایا۔ یہ ارشاد فرمایا کہ میرے والد صاحبؒ نے بھی مجھ سے بچپن میں قیصر جہاں کے نکاح کے متعلق دریافت فرمایا تھا تو میں نے یہ جواب دیا تھا کہ ان شہزادی سے نکاح کے بعد بوریے پر لیٹنا تو کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ اور یہ قصہ سنا کر یہ فرمایا کہ میرے اور تیرے جواب میں آسمان زمین کا فرق ہے، تیرے جواب سے تکبر کی بو ٹپکتی ہے۔ اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے کہ بہت ہی باریک نگاہ سے میری ہر حرکت کو دیکھا کرتے تھے۔

یہ ساری باتیں تو ایک ابتلاء کے دور کی ہیں اور یہ بھی چند واقعات ذکر کئے ورنہ ان جزئیات کے لئے ایک ''الف لیلہ'' چاہئے۔ اللہ جل شانہٗ نے ہر ہر موقع پر انتہائی کرم اور لطف اور مدد فرمائی۔

انوکھی تربیت

اس سے زیادہ اہم اور نہایت ہی اہم عنوان ''تربیت'' کا تھا۔ جس کو علی میاں نے بالکل ہی اڑا دیا، ضمناً کہیں کہیں ایک دو واقعے آگئے ہیں۔ یہ عنوان بھی بہت طویل ہے، جس طرح میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اس سیہ کار کی تربیت فرمائی وہ درحقیقت بہت ہی اہم اور بہت ہی دقیق اور شدید نگرانیوں کے ساتھ ہوئی۔ اگر مجھ میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی تو میں یقیناً آج کچھ بنا ہوا ہوتا، مگر مثل مشہور ہے کہ کتے کی دم بارہ سال نلکی میں رکھی مگر وہ سیدھی ہو کر نہ دی۔

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں سب سے زیادہ شدت ترک تعلقات پر تھی۔ ان کا مقولہ جو بار بار انہوں نے ارشاد فرمایا یہ تھا کہ ''آدمی چاہے کتنا ہی غبی اور کند ذہن ہو اگر اس میں تعلقات کا مرض نہیں تو وہ کسی وقت ذی استعداد بن کر رہتا ہے، اور آدمی چاہے جتنا بھی ذی استعداد، ذہین اور علم کا شوقین ہو اگر اس کو تعلقات کا چسکہ ہے تو وہ اپنے جوہروں کو کھو کر رہے گا۔''

اس کے ساتھ ساتھ ابتداء عمر میں امردوں کا کسی سے میل جول ان کے نزدیک خطرناک تھا۔ اس کو علی میاں نے تحریر تو فرمایا، جیسا کہ (صفحہ ۷۹) پر لکھا ہے۔ لیکن اس کو الٹا کر دیا۔ یہ تو میری مجال ہی نہ تھی کہ میں کسی کو سلام کروں یا میں از خود کسی ایسے شخص کے پاس جماعت کی نماز میں کھڑا ہوں جس کے پاس اس سے پہلے کی نماز میں کھڑا ہو چکا ہوں۔ اگر کوئی

دوسرا اجنبی مجھے سلام کر لیتا تھا تو مجھ سے جواب طلب ہو جاتا کہ یہ کون ہے؟ اور اگر کوئی ایسا شخص جو پہلی نماز میں بھی میرے برابر ہوتا تھا، اتفاقاً میرے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا تو مجھے ڈر کے مارے نیت توڑ کر جانا پڑ جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس کو بھگتنا تو مجھے پڑتا تھا اور اس خیال سے کہ پاس والے کو یہ خیال ہوگا کہ کیا بات ہوئی، کبھی کھانسنے کا بہانہ کرتا تھا اور کبھی ناک پکڑ کر کہ گویا نکسیر آ گئی ہے، وہاں سے نکلتا تھا اور ان دونوں چیزوں کا ردعمل اب اس زور سے ہو رہا ہے کہ سلام کا تو کہنا ہی کیا میری معذوری کی وجہ سے دونوں طرف اٹھانے والے گویا متعین ہیں۔

اس کے ساتھ ہی میرے والد صاحب کی نگاہ میں بڑی اہم چیز صاحبزادگی کا مسئلہ بھی تھا۔ ان کا بار بار کا سینکڑوں دفعہ کا سنا ہوا مقولہ کہ یہ صاحبزادگی کا سُوَر بہت دیر میں نکلتا ہے۔ اس ناکارہ کے متعلق اگر کبھی ان کو کسی فعل سے اس کا شبہ بھی ہو جاتا تھا تو پھر خیر نہیں ہوتی تھی۔ ابھی ایک واقعہ اس سلسلہ میں لکھوں گا۔

میرے پیارے دوست! لکھنے کی چیزیں تو یہی تھیں علی میاں نے ایران، توران اور فضول باتیں لکھ دیں، ان سے کسی کو کیا فائدہ ہوگا، اور میری نگاہ میں تو مبالغہ بھی بہت ہے۔ مختصراً اپنی تربیت کے چند واقعات ضرور لکھوں گا۔ اگرچہ یہ چیزیں بعد از وقت ہیں، اگر میں مسوّدے کو پہلے دیکھ لیتا تو امید تو نہیں تھی کہ علی میاں ان کو میرے الفاظ میں چھاپ دیں گے لیکن میں تو اصرار کر ہی دیتا۔ میں تو حدیث پاک کے سبقوں میں ہمیشہ انہی واقعات کو بہت لطف اور مزے سے نقل کرتا ہوں اور بڑی دعائیں دیتا ہوں کہ ان کے جوتوں ہی کی برکت سے دینداری کی ظاہری صورت بنائے بیٹھا ہوں اور ان کی ہر مار پر بڑی دعائیں دیتا ہوں، گو اس وقت بتقاضائے عمر اور نافہمی جتنا بھی رویا ہوں یا رنج و غضب کیا ہو ظاہر ہے۔

تربیت کے سلسلے میں (۹) واقعات

چند واقعات ضرور سنو تم کو لطف آئے یا نہ آئے مجھے تو لکھنے میں لطف آوے ہی گا۔

(۱) میری عمر تین چار سال کی تھی، اچھی طرح سے چلنا بھی بے تکلف نہیں سیکھا تھا، سارا منظر خوب یاد ہے اور ایسی باتیں "اَوْقَعُ فِی الذِّهْن" ہوا کرتی ہیں۔ میری والدہ نَوَّرَ اللّٰہ مَرْقَدَهَا کو مجھ سے عشق تھا، ماؤں کو محبت تو ہوا ہی کرتی ہے۔ مگر جتنی محبت ان کو تھی اللہ ان کو بہت بلند درجے عطا فرمائے۔ میں نے ماؤں میں بہت کم دیکھی، اس وقت انہوں نے میرے لئے ایک خوبصورت تکیہ چھوٹا سا سیا تھا۔ ایک بالشت میری موجودہ بالشت سے چوڑا اور ڈیڑھ بالشت لمبا، اس کی ہیئت بھی کبھی نہیں بھولوں گا، اس کے اوپر گوٹہ ٹھپہ، گوکھرو، کرن بنت وغیرہ سب کچھ ہی جُڑا ہوا تھا۔ نیچے لال قند کا غلاف اور اس پر سفید جالی کا جھالر، بہت ہی خوشنما، وہ

مجھے اتنا محبوب تھا کہ بجائے سر کے میرے سینے کے اوپر رہا کرتا تھا، کبھی اس کو پیار کرتا، کبھی سینے سے چمٹایا کرتا۔ والد صاحب نے آواز دے کر فرمایا کہ ''زکریا مجھے تکیہ دے دے''۔ مجھ میں پدری محبت نے جوش مارا اور اپنے نزدیک ایثار اور گویا دل پیش کر دینے کی نیت سے میں نے کہا کہ ''میں اپنا تکیہ لے آؤں''۔ فرمایا کہ ''ورے آ''۔ میں انتہائی ذوق وشوق میں کہ ابا جان اس نیاز مندی اور سعادت مندی پر بہت خوش ہوں گے، دوڑا ہوا گیا۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اور داہنے ہاتھ سے منہ پر ایسا زور سے تھپڑ رسید کیا کہ آج تک تو اس کی لذت بھولا نہیں اور مرتے وقت تک امید نہیں کہ بھولوں گا۔ اور یوں فرمایا کہ ''ابھی سے باپ کے مال پر یوں کہتا ہے کہ اپنا لاؤں، کچھ کما کر ہی کہنا کہ اپنا لاؤں''۔ اللہ ہی کا فضل وکرم ہے اور محض اس کا ہی لطف واحسان ہے کہ اس کے بعد سے جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو دل میں یہ مضمون پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ اپنا اس دنیا میں مال نہیں۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ دن بدن یہ مضمون پختہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

(۲) میری عمر آٹھ سال کی تھی، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے وصال کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ حضرت کے وصال کے بعد والد صاحب نے خانقاہ شریف ہی میں بچوں کو تعلیم دینا شروع کر دیا تھا اور جس وقت یہ واقعہ لکھ رہا ہوں خوب یاد ہے کہ اسّی (۸۰) لڑکے تھے، ان میں قاعدہ بغدادی پڑھنے والے بھی تھے اور حماسہ اور ہدایہ اولین پڑھنے والے بھی۔ اوپر کے اسباق تو والد صاحب اور چچا جان پڑھایا کرتے تھے اور ہر اونچی جماعت والے کے ذمہ اس سے نیچے والی جماعت کے اسباق ہوتے تھے کہ اپنے پڑھے اور ان کو پڑھائے اور والد صاحب کے سامنے یہ اسباق پڑھائے جاتے تھے۔ خانقاہ کی مسجد میں اس وقت تک والد صاحب ہی نماز پڑھاتے تھے۔ نماز شروع ہوگئی اور میں خانقاہ کی مسجد میں ایک طاق تھا، اس پر ہاتھ رکھ کر لٹکنے کی کوشش میں تھا مگر اس پر میرا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔ ان شاگردوں میں ایک شخص مولوی صغیر احمد تھے جو معلوم نہیں اب حیات ہیں یا نہیں مگر گنگوہ کے رہنے والے اور بعد میں بمبئی کے بڑے واعظوں میں ہوگئے تھے، وہ وضو کر کے جلدی سے آئے اور ادھر رکوع شروع ہوگیا، انہوں نے تیزی سے آکر محبت کی بناء پر مجھے طاق پر لٹکا دیا، مجھے غصہ آگیا کہ میری مساعی جمیلہ میں اس نے ٹانگ کیوں اڑائی۔ جب سب سجدہ میں گئے تو میں نے مولوی صغیر کی کمر میں زور سے ڈُک مارا، چوٹ تو ان کو کیا لگتی مگر آواز بہت ہوئی۔ نماز پڑھتے ہی مقدمہ قائم ہوگیا، خانقاہ میں گولر کے نیچے سارا مجمع اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی سہ دری کے آخری در کے سامنے ابا جان۔ اور مطالبہ یہ ''کہ کس نے مارا تھا اور کس کے مارا تھا؟'' مگر ڈر کی وجہ سے کوئی بولا نہیں

۔دس بارہ منٹ کے بعد فرمایا کہ اچھا اب تو سبق کا حرج ہو رہا ہے سبق کے بعد سب کی چھٹی بند جب تک کہ تحقیق نہ ہو جائے۔ عصر کے بعد دوبارہ میدان حشر قائم ہوا، ان کا مطالبہ اور جواب میں سکوت۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک کو جانے کی اجازت نہیں چاہے صبح ہو جائے۔ اور میں اپنے دل میں یہ دعائیں کر رہا تھا کہ جو ہونا ہوگا ہو جائے گا مولوی صغیر جلدی سے بتا دیں خواہ مخواہ سب پھنس رہے ہیں۔ بالکل میدانِ حشر کا منظر تھا جس کی بناء پر سب پریشان پھر رہے تھے۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد مولوی صغیر نے دبی ہوئی اور مری ہوئی آواز زبان سے کہا کہ "میرے مارا تھا"۔ اب تو مقدمہ کا بہت سی حصہ گویا طے ہو چکا۔ اس پر سختی سے مطالبہ ہوا کہ "کس نے؟" مگر وہ چُپ۔ جب اس نے دیکھا کہ "ضَرَبَ یَضْرِبُ" ہونے کو ہے تو اس نے میری طرف اشارہ کیا کہ "اس نے"۔ اس پر والد صاحب نے فرمایا کہ "اِس نے؟" انہوں نے کہا جی پھر فرمایا کہ "اس نے؟" اس وقت والد صاحب کا دستور عصر کے بعد گنگوہیؒ کے مزار پر حاضری کا تھا، یہ نابکار بھی ساتھ ہوتا اور میری ایک چھوٹی سی چھتری تھی جو ٹوٹ گئی تھی اور اس کی ڈنڈی کو لکڑی بنا لیا تھا جو مزار پر جانے کے وقت میں میرے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی، میرے ہی ہاتھ سے چھین پر اتنا مارا کہ وہ چھوٹی سی لکڑی بھی دو جگہ سے ٹوٹ گئی، اور صرف ایک لفظ ان کی زبان پر ہر مار پر ہوتا تھا "ابھی سے صاحبزادگی کا یہ سُور"۔ انہیں یہ خیال پیدا ہوا تھا بد صاحبزادگی باپ کے شاگرد کو مار دیا۔ سردی کا زمانہ تھا اور میں روئی کا انگرکھا پہنا کرتا تھا مگر اس وقت نہیں تھا، اس لئے کہ صبح اور عشاء کے وقت پہنا کرتا تھا اور عصر کے وقت چونکہ سردی نہیں ہوتی تھی، اس وقت صرف ایک ہی کرتہ بدن پر تھا۔ میرے بازو اتنے سُوج گئے تھے کہ پندرہ دن تک انگرکھا بالکل نہیں پہن سکا۔ اس وقت تو نہیں مگر ان کا ایک خاص مقولہ جو کئی دفعہ مجھ سے فرمایا، یہ تھا کہ "اگر تو پٹتے پٹتے مر گیا تو تُو شہید ہوگا، مجھے ثواب ہوگا"۔ آپ خود سوچیں کہ جس کا یہ نظریہ ہو وہ کیا کسر چھوڑے گا۔

(۳) اسی زمانے کا قصہ ہے کہ اس نابکار کو بزرگی کا جوش ہوا اور مغرب کے بعد حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے حجرے کے سامنے لمبی نفلوں کی نیت باندھ لی۔ ابا جان نے آکر زور سے تھپڑ مارا اور فرمایا کہ "سبق یاد نہیں کیا جاتا"۔ میرے چچا جان "اس زمانے میں بڑی لمبی نفلیں پڑھا کرتے تھے۔ بعد مغرب سے عشاء کی اذان کے قریب فارغ ہوا کرتے تھے۔ لیکن والد صاحب کے یہاں مختصر سی نوافل کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس وقت تو مجھے بہت غصہ آیا کہ خود تو پڑھی نہیں جاتی، دوسرے کو بھی پڑھنے نہیں دیتے۔ مگر جلدی ہی سمجھ میں آ گیا کہ بات صحیح تھی، وہ نفلیں بھی شیطانی حربہ علم سے روکنے کے واسطے تھا۔ اس لئے کہ جب نفلیں

پڑھنے کا دور آیا تو اب نفس بہانے ڈھونڈتا ہے۔

(۴) میری عمر دس سال تھی۔ میری والدہ گنگوہ سے رامپور جا رہی تھیں۔ بہلی میں اور بھی چند مستورات تھیں اور میں بھی تھا۔ ایک ٹٹو (گھوڑی) جس کے ساتھ اس کا چلانے والا بھی تھا، اس پر والد صاحب تشریف فرما تھے۔ والد صاحبؒ کو گھوڑے کی سواری کی عادت نہ تھی مگر معمولی سا ٹٹو جس کے ساتھ چلانے والا بھی ہو اس پر دو دفعہ بیٹھنے کی نوبت آئی۔ راستہ میں ایک جگہ والد صاحبؒ نے ازراہِ شفقت ارشاد فرمایا کہ ''تو گھوڑی پر بیٹھے گا؟'' میں نے بہت شوق سے کہا ''جی''۔ اور شوق سے کود پڑا اور گھوڑی پر بیٹھ کر اور شوق سے عزت میں گھوڑا کو بہلی کے سامنے لایا۔ میری والدہ نے اور دوسری مستورات نے جب میں قریب پہنچا، کچھ زبان سے اور کچھ اشارے سے کہ بُری بات ہے ابا تو پاؤں جا رہے ہیں اور تُو گھوڑی پر بیٹھا ہے۔ میں نے ابا جان سے عرض کیا کہ عورتیں یوں کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے بہت غصہ میں فرمایا کہ ''اندھی کے تجھے نظر نہیں آتا، عورتیں ہی کہہ رہی ہیں تیری آنکھیں پھوٹ گئیں ہیں''۔ مابدولت بیک بینی و دو گوش گھوڑی سے اتر کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس بات پر مجھے اللہ کا شکر ہے کہ کوئی گرانی نہیں ہوئی اور میرے ذہن میں تھا کہ تو نے برا کیا۔

(۵) میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو اس کا بھی بہت اہتمام تھا کہ میرے پاس پیسہ نہ رہے۔ کسی دوسرے سے پیسہ لینا تو درکنار کسی کھانے پینے کی چیز کا لینا بھی ناممکن تھا بلکہ اس کے شبہ پر بھی سخت تحقیقات ہوتی تھیں۔ جیسا کہ اگلے نمبر پر مستقل ایک واقعہ ذکر کروں گا۔ البتہ خود پیسے دینے کا معمول تھا اور ساتھ یہ کہ میرے پاس پیسہ نہ رہے، اس لئے جب مجھے کچھ دینے کا ارادہ فرماتے تو پہلے والدہ سے فرما دیتے کہ زکریا کو اتنا پیسہ یا روپیہ دینا ہے اور والدہ نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَھَا اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی اونچے درجے عطا فرمائے۔ مجھ سے محبت بے انتہا تھی، اسی وقت سے مجھے قرض دینے کے فضائل اور ثواب اتنے لَاتُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی سُناتیں اور آخرت میں کارآمد ہونے کی ترغیبیں اور دنیا میں جو خرچ ہوا سکی لغویت بتلاتیں اور اس کے بعد پھر فرماتیں کہ ''تیرے پاس کچھ پیسے ہوں تو دے دے تجھے ثواب ہوگا''۔ کچھ تو واقعی والدہ کی محبت اور کچھ ثواب کی اہمیت تو اس وقت کہاں ہوتی، البتہ ''مَنْ نُوْقِشَ فِی الْحِسَابِ فَقَدْ عُذِّبَ'' کا نقشہ بغیر حدیث پڑھے ہی سامنے تھا اس لئے کہ ان پیسوں کا حساب دینا تو کارے دارد تھا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ اب تک پیسہ جیب میں رکھنے کی عادت نہیں۔ اللہ نے دوست و احباب ایسے مہیا کر رکھے ہیں کہ وہ ہر وقت میری فرمائشیں پوری کرتے رہتے ہیں اور دو چار دن میں ایک بل مجھے دے دیتے ہیں اور یہ وہی دستِ غیب کا نسخہ ہے جو کسی تبلیغی اجتماع میں

صوفی عبدالرب صاحب کو بتلایا تھا۔

(۶) اس سے پہلے نمبر میں لکھا تھا کہ شبہ پر تحقیقات ہوتی تھیں ایک واقعہ مثال کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ مدرسہ قدیم (دفتر مدرسہ مظاہر علوم) کی چھت پر والد صاحب کا قیام اور پیشاب کی جگہ اسی چھت پر اس کے بالمقابل تھی۔ والد صاحب پیشاب کے لئے تشریف لے گئے، راستہ میں ایک جگہ سے کباب کی خوشبو آئی جو مولانا ظفر احمد صاحب پاکستانی شیخ الاسلام پاکستان نے کسی طالب علم سے بعد مغرب یہ کہہ کر کہ ایک کباب لا کر یہاں رکھ دینا میں نفلوں کے بعد لے لوں گا۔ نماز کی نیت باندھ لی۔ والد صاحب کے بعد میں پیشاب کو گیا۔ والد صاحب کو یہ شبہ ہوا کہ وہ کباب اس نے منگائے تھے اور پیشاب کے بہانے سے یہ کھا کر آیا ہے، مجھ سے مطالبہ فرمایا کہ ''وہ کباب کس کے ہیں؟'' میں نے لاعلمی ظاہر کی، اول تو سختی سے فرمایا، پھر جا کر ان کو دیکھا تو وہ وہیں رکھے تھے۔ چونکہ مولانا ظفر احمد صاحب ان زمانے میں شریکِ دسترخوان تھے۔ جب سب حضرات کھانے کے واسطے بیٹھے تو مولانا ظفر احمد صاحب نے کسی طالب علم سے فرمایا کہ وہاں کباب رکھے ہیں وہ اٹھالاؤ تو والد صاحبؒ کو اطمینان ہوا۔

(۷) پیسوں کے سلسلے میں ایک عجیب واقعہ سناؤں۔ ان کی تعلیم کا طرز تو عجیب ونرالا تھا۔ ان کے یہاں اہم کتاب کے شروع پر یا ختم پر مٹھائی کے نام سے کچھ پیسے ملنے کا بھی دستور تھا جو میرے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ مخصوص شاگردوں میں سب ہی کے ساتھ تھا۔ لیکن میرے ساتھ یہ خصوصیت تھی کہ ان پیسوں کی مٹھائی کھانا سخت معیوب تھا، بلکہ نہایت سنگین جرم تھا کہ یہ ان کے یہاں چٹور پن تھا، بلکہ ان پیسوں کا مصرف کوئی ضرورت کی چیز کتاب وغیرہ یا والدہ کے توسط سے کوئی مقوی دماغ چیز تھی۔ جب میرا فقہ شروع ہوا اور ان کے یہاں تعلیم میں بھی جدت تھی، جس کا اثر چچا جان کی تعلیم میں بھی تھا کہ ان کے یہاں درس نظامی کی پابندی نہیں تھی بلکہ ہر شخص کی حیثیت کے موافق کتاب تجویز ہوتی تھی ''الفیہ ابن مالک'' کا سبق روزانہ حفظ سنا کرتے تھے۔ ان کے یہاں ہدایہ النحو اور کافیہ ساتھ ہوا کرتا تھا۔ کافیہ کی ترتیب پر جتنا سبق شام کو کافیہ کا مناسب ہوتا اس کی بقدر صبح کو ہدایۃ النحو ہوتی تاکہ وہ کافیہ کے لئے مطالعہ کا کام دے۔ اسی طرح قدوری اور کنز ساتھ ہوتی کنز کی کی ترتیب پر۔ جب میرا فقہ شروع ہوا یعنی قدوری اور کنز کی بسم اللہ ہوئی تو مجھے بیس روپے انعام ملے تھے اور دینے کے بعد فرمایا کہ ''ان کا کیا کرو گے؟'' میں چونکہ بھیڑیئے کی آنکھ سے سبق پڑھے ہوئے تھا، میں نے کہا کہ میرا یوں جی چاہتا ہے کہ اپنے چاروں بزرگ حضرت سہارنپوری، حضرت دیوبندی، حضرت رائے پوری، حضرت تھانوی کو پانچ پانچ روپے کی مٹھائی پیش کروں۔ یہ میری تجویز کسی اخلاق پر تو مبنی تھی ''مَنْ

حُوْسِبَ عُذِّب" کے ڈر سے تھی۔ بڑی شاباش ملی اور میری فہم ودانش پر مبارکباد۔ پھر فرمایا کہ "مٹھائی کیا دے گا؟" اس کے بعد لکھنے والے نے کہا کہ کہ یہ قصہ الخ علی میاں سوانح میں حاشیہ، صفحہ نمبر ۹۷ پر لکھ چکے ہیں، اس لئے اسی جگہ پر ختم کر دیا۔ البتہ ابتدائی حصہ کی ترتیب اور میری تجویز کی وجہ اس میں نہیں ہے۔

(۸) کاندھلہ کی عید کا واقعہ بھی علی میاں نے صفحہ نمبر ۴۷ پر لکھا تو ہے مگر بہتم تختصر۔ رمضان المبارک ۲۸ھ میں جب کہ میری عمر تیرہ سال کی تھی اور سہارنپور آنے کے بعد پہلی عید تھی۔ کاندھلہ اس سے پہلے شاید تین چار سال کی عمر میں ایک عید کی تھی۔ اس کی چہل پہل، عیدگاہ میں بچوں کے ساتھ جانا ور عیدگاہ کے مناظر خوب یاد تھے۔ ۱۵ رمضان کے آس پاس والد صاحب نے ازراہِ شفقت ومراحم خسر وانہ فرمایا کہ "تیرا کاندھلہ عید کرنے کو جی چاہتا ہے؟" میں نے بڑے زور سے کہا کہ "جی"۔ فرمایا کہ "اچھی بات ہے ۲۹ کو بھیج دوں گا"۔ خوب یاد ہے کہ یہ پندرہ دن خوشی کے اندر ہر روز عید تھا ور ہر رات شب قدر۔ کبھی خوشی میں اچھل بھی پڑتا تھا اور ایک ایک دن بڑی مشکل سے گزارتا تھا اور جب ۲۹ کی رات آئی تو پھر کیا پوچھنا۔ سوچتا تھا کہ اب کسی کے ساتھ جانا طے ہوگا ۲۹ کی صبح کو میں تو ہر آن۔

"چون گوش روزہ دار بر اللہ اکبر است"

اس آواز کا منتظر تھا کہ یہ فرمائیں کہ "جا فلاں کے ساتھ چلا جا"۔ انہوں نے دس گیارہ بجے کے قریب نہایت رعب دار منہ بنا کر فرمایا کہ "بس کیا کرے گا جا کر؟" آواز سے تو ہم رو ہی نہیں سکتے تھے، آنسوؤں پر قابو ہی نہیں تھا۔ بے اختیار نکل پڑے اور حجرہ میں جا کر پھر جو ہچکیوں کے ساتھ رونا شروع کیا، اللہ بہت ہی معاف فرمائے جو منہ میں آیا سب کچھ کہہ دیا۔ بھلا اس جھوٹے وعدہ کی کیا ضرورت تھی؟ بزرگ ہو کر بھی مکاری کرتے ہیں۔ میں نے کون سی درخواست یا منت کی تھی۔ اپنے آپ خود ہی تو وعدہ کیا۔ اور وہ دن اور دوسرا عید کا دن میرے لئے محرّم تھا اور وہ میری لال آنکھوں اور آنسوؤں کو خوب دیکھ رہے تھے مگر ایک لفظ نہیں کہہ کر دیا۔ عید سے دوسرے دن یوں فرمایا کہ "میرا جی تو چاہتا تھا تیرے بھیجنے کو اور میرا ارادہ بھی تھا مگر جتنی خوشی تو نے جانے کی کی وہ مجھے اچھی نہیں لگی۔" اس وقت تو بھلا آپ کیا جانیں کہ کیا سمجھ آتی مگر اب واقعی سمجھ میں آ گئی کہ ﴿ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ ﴾ کی داغ بیل پڑ گئی۔

(۹) مجھے کبھی بچپن میں اچھا پہننا یاد نہیں، اپنے ہوش سے پہلے والدہ نے پہنائے ہوں تو یاد نہیں۔ ان زمانے میں ہر جمعہ کو سر منڈانا بھی ضروری تھا کہ بال بھی زینت ہیں۔ کاندھلہ میرا

وطن ہے لیکن عمر بھر میں کبھی بھی تین مرتبہ کے علاوہ ایک دو شب سے زیادہ قیام یاد نہیں۔ بلکہ ہوا ہی نہیں۔ پہلی دفعہ ان تین میں سے والد صاحب کی حیات میں ہے جس کا قصہ لکھ رہا ہوں اور دو (۲) دفعہ ان کے وصال کے بعد۔ ان میں سے پہلی مرتبہ ۳۶ھ میں جب کہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سہارنپور سے دہلی منتقل ہوئے۔ روانگی سے قبل بیماری یہیں شروع ہوگئی تھی۔ کاندھلہ دو چار روز بعد علاج ٹھہرنے کا ارادہ تھا مگر مرض نے اتنا طول پکڑا کہ ہر روز ان کی حیات کا آخری دن تھا۔ اس کی سرگزشت بھی بڑی عجیب ہے اور بڑے عجیب واقعات اس میں پیش آئے جو بڑی لمبی داستانیں ہیں اس بیماری میں چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے جنات کی بیعت ہوئی۔ یہ قیام سب سے زیادہ طویل ہوا۔ تیسری مرتبہ ۴۲ھ میں جب کہ میری حقیقی پھوپھی مرحومہ سخت علالت کے بعد انتقال فرما گئیں۔ ان کے انتقال کا بھی بڑا عجیب واقعہ ہے۔ بہت سخت بیمار تھیں، اشارہ سے نماز پڑھتی تھیں۔ اسہال کبدی کئی دن سے تھے کہ بوقت صادق یوم دوشنبہ "مجھے جلدی بٹھا، مجھے جلدی بٹھا تو پیچھے سہارا لگا دے" مجھے خیال ہوا کہ اذان کا وقت ہو گیا ہے مبادا اس میں دیر ہو جائے، میں نے ایک دوسرے عزیز کو اشارہ کیا وہ جلدی سے بیٹھ گئے۔ انہوں نے جلدی میں فرمایا کہ تو بیٹھ حضور تشریف لے آئے اور ہاتھ سے کوٹھے کی طرف اشارہ کیا کہ حضور تشریف لے آئے اور یہ کہتے ہی گردن پیچھے کو گر گئی۔ رَحِمَهَا اللّٰهُ رَحْمَةً وَاسِعَةً.

ایک اہم واقعہ

اس جگہ جس واقعے کو لکھنا ہے وہ بہت ہی اہم ہے اور بہت ہی عجیب ہے۔ اوائل ۳۰ھ میں جب کہ میری عمر ۱۵ برس کی تھی، میری والدہ مرحومہ کاندھلہ میں نہایت ہی سخت علیل ہوئیں اور ایسی علیل ہوئیں کہ ہر دن ان کی زندگی کا آخری تھا۔ (اگرچہ اس مرض میں انتقال نہیں ہوا) والد صاحبؒ کو جب اس شدت مرض اور مایوسی کی حالت اور میری یاد کی خبر پہنچی تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ پانچ سات دن کا قصہ ہے مجھے کاندھلہ بھیج دیا اور اتنا لمبا چوڑا کام میرے سپرد کر دیا کہ پندرہ سولہ گھنٹے تک بھی پورا نہ ہو سکے۔ روزانہ تاریخوار مقامات کے سو (۱۰۰) لغت لکھنا اور صراح وغیرہ دوسری کتب کی مدد سے ان کا ترجمہ بھی لکھنا۔ پھوپھا مرحوم (پھوپا رضی الحسن صاحب) سے سُلّم کا سبق پڑھنا۔ ایک منزل روزانہ قرآن کی دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد دادی صاحبہ (جو حافظۂ قرآن تھیں) کو سنانا اور تین سبق فارسی کے گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، حاجی محسن مرحوم کو پڑھانا۔

چونکہ مجھے کبھی اچھا کپڑا پہننے کی نوبت نہ آئی تھی اور میری والدہ کی انتہائی خواہش اور تمنا یہ تھی کہ وہ مجھے کبھی اچھے کپڑے پہنے ہوئے دیکھیں۔ مگر والد صاحبؒ کے خوف سے وہ بھی

نہیں بنا سکتی تھیں۔ چونکہ وہ ان کی مایوسی کی حالت تھی اور ہر دن کو وہ اپنا آخری دن سمجھتی تھیں، اس لئے انہوں نے میری خالہ و پھوپھیوں سے اپنی خواہش کا اظہار فرمایا اور چونکہ ہر رشتہ دار اس وقت ان کی ہر دل جوئی کا متمنی تھا۔ اس لئے سب نے مل کر نہایت نفیس جوڑا میرے لئے سیا۔ والدہ نے یہ بھی کہا کہ اگر میں زندہ رہی تو اس کے دام ادا کر دوں گی۔ سب نے کہا کہ ایسے لفظ مت کہو کیا یہ تمہارا ہی بچہ ہے ہمارا نہیں۔ بہر حال ان کی عجلت پر نہایت عمدہ جوڑا سِلا۔ جواب تک نظروں میں ہے۔

نہایت ہی نفیس حسین ایک گلابی بنیان، اس پر نہایت ہی باریک چکن کا کرتہ اور نہایت ہی عمدہ ''سیلے کا عمامہ''۔ اور چونکہ اس وقت میرے تمام عزیز علی گڑھ میں پڑھتے تھے اور سب سلیپر پہنتے تھے گو اس سے پہلے میں نے نہ کبھی پہنے اور نہ پسند آیا۔ ساری عمر دھوڑی کا جوتہ اور وہ بھی بغیر پھول کے، مگر ماحول کا تو اثر ہوتا ہی ہے۔ بھائی اکرام، ظہیر الحسن مرحوم، ماسٹر محمود، یہ سب لوگ سلیپر پہنتے تھے مگر معمولی اور اس وقت ہمارے اور والدہ مرحومہ کے شوق سے خریدا جا رہا تھا، اس لئے باٹا کا نہایت ہی مضبوط سولہ روپے کا سلیپر خریدا اور اس وقت کے سولہ آج کے پچاس روپے سے کم تو نہ ہوں گے۔ دو تین دن میں بڑی محنت اور بہت عجلت سے میری خالہ اور پھوپھیوں نے بہت ہی نفیس جوڑا سِیا۔ درمیان میں مکان کا انداز بھی سنئے۔ اس زمانے میں یہ نوعیت ہوتی تو تھی۔ بہت سے قصبات میں، مگر ہمارے مکانوں کی نوعیت یہ تھی کہ صدر دروازے کے متصل تو مردانہ بیٹھک تھی اور دروازہ (۲) ایسا تھا کہ اگر اس کو بند کر دیا جائے تو اندر کے مکانات میں جن کے اندر کھڑکیاں اور دروازے تھے ایک مکان؟؟ میں گھس کر بغیر پردہ کرائے عورتیں ایک دوسرے کے مکانات میں آ جا سکتی تھیں اور چور کھڑکی (۳) میں اور صدر دروازے میں تقریباً دو (۲) فرلانگ کا فرق ہے اور اندر سب مکانات ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ مکانات کا تحفظ بھی اور غالباً غدر کے زمانے میں اس نوعیت کے بنائے گئے تھے کہ اگر فوج کی یورش صدر دروازے کی طرف سے چلے تو مستور کھڑکی کی طرف کو فوراً نکل جائیں۔ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ بھی کئی دن تک ان مختلف مکانات میں مستور رہے۔ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ والدہ کی اور میری دونوں کی خیر خبر لینے کے واسطے کاندھلہ تشریف لے گئے اور صدر دروازہ سے نہیں گئے کہ ان کے پہنچنے کا شور ہو جائے گا، چور کھڑکی میں ایک گھر سے دوسرے گھر میں پردہ کراتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ ابھی آ کر ملوں گا، اس دروازے پر پہنچے جو میری والدہ کے گھر کے بالکل سامنے تھا، مابدولت اس شاہی جوڑے کو پہن کر اور اس کی نمائش کرنے کے واسطے دروازے سے نکل رہے تھے۔

ایک دم ایک کی نگاہ دوسرے پر پڑی، ان کی نگاہوں میں شیر ببر کی طرح سے خون کی لہر دوڑ گئی اور میں لنگور کے سامنے بندر ایسی حالت میں تھا کہ پاؤں کے نیچے زمین نہیں تھی اور انہوں نے للکار کر فرمایا کہ ''آگے آ''۔ تعمیل کے سوا چارہ کیا تھا اور وہ نہایت ہی نفیس اور مضبوط جوتا جو چار پانچ منٹ پہلے ہی پاؤں میں ڈالا تھا وہ ان کے ہاتھ میں تھا اور بجائے پیر کے سر پر پڑا پڑ پڑ رہا تھا اور ایک لفظ زبان پر تھا کہ ''تجھے معشوق بننے کے واسطے بھیجا تھا؟'' اور دروازہ ایک دم بند کرا دیا گیا اور سارے گھروں کی مستورات مجھے چھڑانے کے واسطے وہاں جمع ہو گئیں۔ ابا جان نے ایک ڈانٹ پلائی کہ جو چھڑائے گا اس کے جوتا ماروں گا۔ بلا مبالغہ سو (۱۰۰) کے قریب تو سر پر پڑے ہوں گے۔ یہ اس اللہ کا احسان تھا کہ ایڑھی کی طرف نہیں پڑے بلکہ نیچے کی طرف سے پڑے، جس سے سر نہیں پھٹا۔ البتہ صَبیغ کی طرح سے دماغ کا بہترین علاج ہو گیا۔

وہ عمامہ تو اسی وقت تہ کر کے چھوٹی ہمشیرہ کے نکاح کے لئے رکھا گیا اور چکن کے کرتے کی بھی دو (۲) کرتیاں بہن کی شادی کے لئے بنا کر رکھ دی گئیں اور وہ بنیان اور سلیپر عزیز ظہیر الدین مرحوم کو نذرانہ ہو گیا اور عمدہ لٹھے کا پاجامہ اس وقت تو جھک مار کر اُتارنا ہی پڑا اور ہم پھر وہی کرپا وہی جالی۔

اچھے کپڑوں سے نفرت

اللہ کے فضل وانعام واحسان سے اچھے کپڑے سے جو نفرت اس وقت دل میں بیٹھی تھی اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اور اب واقعی اس کے اندر تصنع نہیں کہ اب اچھے کپڑے سے کچھ اس قدر نفرت سی ہو گئی ہے کہ اپنے ہی نہیں دوسرے کے بدن پر بھی اچھا نہیں لگتا، اور اب دماغ میں یہ جم گئی کہ اچھے کپڑے کے اندر کیا فائدہ۔ اگر اچھی غذا کھائی جائے تو خیر و دماغ و جسم کو طاقت ملتی ہے مگر اچھے کپڑے سے نہ رنگ و رُوپ میں فرق پڑے اور نہ بدن میں طاقت آئے۔ پندرہ بیس دن میں وہ اس سے زیادہ میلا ہو جاتا ہے جتنا کہ کھدر بھی نہیں ہوتا۔ میرے حضرت اقدس سائے پوری شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بارہا اچھے اچھے کپڑے عنایت فرمائے اور بارہا فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تجھے اچھے کپڑوں میں دیکھوں، مگر اپنی نالائقی وحماقت سے وہ اچھے اچھے کپڑے جو حضرت کے پاس ہدایا میں آئے تھے اپنی بچیوں کی شادیوں میں دے دیئے۔

کرنل اقبال کا ساٹھ روپے گز کا جوڑا سلوانا

کرنل اقبال بھوپالی میرے بہت ہی کرم فرما اور مخلصوں میں تھے اور محسن بھی تھے بار بار کثرت سے مکہ جاتے تھے اور ہر دفعہ میں کوئی مادی ہدیہ مصلّی، رومال وغیرہ ضرور لاتے تھے

حالانکہ میں سختی سے ہر دفعہ ان سے لڑتا۔ اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے۔ ایک مرتبہ انہوں نے عزیزان مولوی یوسف مرحوم اور مولوی انعام سلمہٗ سے یہ کہا کہ میرا ارادہ بہت دنوں سے شیخ کے لئے بہت بہترین کُرتہ سینے کا ہو رہا ہے۔ عزیزان نے بہت زور سے ان کو منع کر دیا کہ بغیر اجازت نہ بنوانا وہ پہنے گا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں ساٹھ روپے گز کے حساب سے پانچ گز کپڑا ان کے لئے خرید کر لایا ہوں۔ تم شیخ کا کُرتہ چپکے سے مجھے دے دو، میں سلوا کر خود پہنا کر آؤں گا۔ عزیز مولوی انعام سلمہٗ نے کہا کہ بالکل نہیں وہ سِلا ہوا بھی پھاڑ دے گا، پہلے پوچھ لو..... مرحوم کو بار بار کی لڑائی سے تجربہ ہو چکا تھا اس لئے یہ کہا کہ پوچھنے کی تو ہمت نہیں مگر میرا خیال تھا کہ جب وہ سِل جائے گا تو اس کا کُرتہ کسی دوسرے کو تو آئے گا نہیں اس لئے وہ پہن ہی لے گا۔ اللہ کا بڑا ہی احسان ہے اور ایک دو نہیں بیسیوں واقعات اس نوع کے پیش آ چکے ہیں۔ کچھ اچھے کپڑے کی نفرت سر پر سلیپر نے دل میں ایسی پیدا کر دی کہ اب دوسروں پر بھی اچھا کپڑا بُرا لگتا ہے۔

جہیز میں کیا دیا جائے

شادیوں میں عمدہ کپڑوں سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ جہیز اور بری کے نام سے اس قدر روپیہ ضائع کیا جاتا ہے جو محض بے کار ہے یہ شاہانہ جوڑے جو جہیز اور بری میں دیئے جاتے ہیں اور کئی کئی سو میں تیار ہوتے ہیں وہ بالکل بے کار اور اضاعت مال ہے۔ وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ گھروں میں پہنے جا سکیں۔ ایک دو مرتبہ عمر بھر میں کسی کی شادی میں دکھلاوے کے لئے پہننے کے علاوہ کوئی مصرف ان کا نہیں۔ پھر وہ رکھے رکھے گل جاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مر جائے تو مدرسوں کے اندر جا کر کوڑیوں کے بھاؤ نیلام ہوتے ہیں۔

میں لڑکیوں کو دینے کا مخالف نہیں ہوں بلکہ بڑا مُعین ہوں۔ مگر کپڑے اور لمبی چوڑی دعوتوں کا بہت مخالف ہوں۔ ان دونوں لغویات میں جس قدر روپیہ خرچ ہوتا ہے اتنی رقم کا زیور اگر لڑکیوں کو دے دیا جائے تو کس قدر ان کے لئے وقت پر کام آنے والی چیز ہے۔ زیوروں میں بھی ایسے زیوروں کا مخالف ہوں جن کے اندر گھڑائی تو بہت جائے اور مالیت کچھ نہ ہو کہ اگر بوقتِ ضرورت فروخت کیا جائے تو گھڑائی کی تو قیمت ہی نہیں۔ اگر ایسے زیور جن کے اندر گھڑائی تو نہ ہو اور مالیت زیادہ ہو جیسے کڑے وغیرہ تو ان بیچاریوں کے وقت پر کام آ جائے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو حج کی سعادت عطا فرمائے تو کرایہ تو تیار ملے۔ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ یہ میری ضربات کی آخری ضرب تھی۔ اس کے بعد ایک

آئندہ تھپڑ تو شاید کبھی لگا ہو ورنہ قابلِ یاد کوئی مار نہیں۔ اللہ جَلَّ شَانُہٗ اپنے فضل وکرم سے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو ان ضربات کی بہتر سے بہتر جزائے خیر عطا فرمائے اور ہر مار پہ لاکھوں رحمتیں ان پر نازل فرمائے، آمین ثم آمین! کہ یہ ناکارہ سیاہ کار کُتّے کی دم کی طرح سے جس کو اس کے مالک نے بارہ سال تک نلی میں اس لئے رکھا کہ وہی سیدھی ہو جائے اور بارہ سال کے بعد وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی تھی۔ حالت تو اپنی خراب ہی رہی لیکن ان تنبیہات اور تربیت اور اللہ کے فضل واحسان کی وجہ سے آدمیوں میں شمار ہونے لگا۔ البتہ نہ معلوم کس جون میں ہوتا۔

(۱۰) مار خوب یاد رہا کرتی ہے۔ مار تو نمبر ۹ پر ختم ہوگئی۔ البتہ تنبیہات ضرور باقی رہ گئی تھیں۔

والد صاحب عزِ تعلم دسواں واقعہ

جس طرح میں لکھ چکا ہوں کہ ان کا طرزِ تعلیم بالکل الگ تھا۔ مشکوٰۃ شریف میں نے ترجمہ سے نہیں پڑھی، ساری بلا ترجمہ پڑھی۔ اس میں یہ اجازت تھی کہ جس لفظ کا جی چاہے ترجمہ پوچھ لوں اور وہ امتحاناً کبھی کبھی پوچھتے رہتے تھے۔ ترجمہ مظاہر حق کا دیکھنا تو جُرم تھا، ہدایہ اور طحاوی کا دیکھنا ضروری تھا اور صِحاح کی کتابوں میں سے جس کتاب کی حدیث ہو اس کو نکال کر اس کے حواشی دیکھنے کی اجازت تھی۔ قانونِ تعلیم یہ تھا کہ ہر حدیث کے بعد یہ بتانا ضروری تھا کہ حَنَفِیّہ کے موافق ہے یا خلاف، اگر خلاف ہے تو حنفیہ کی دلیل اور حدیث پاک کا جواب، یہ تمام گویا حدیث کا جُزو لازم تھا جو میرے ذمہ تھا۔ اپنی دلیل نہ بتانا تو یاد نہیں، اس لئے کہ ہدایہ اور اس کی شروح اور حواشی اور فِقہ کی دوسری کتابیں دیکھنے کی نوبت کثرت سے آتی رہتی تھی۔ البتہ حدیث کا جواب کبھی کبھی نہیں دے سکتا تھا تو وہ خود بتاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک وعید کی حدیث کی توجیہ میں بندہ نے یوں کہہ دیا کہ ''تشدد پر محمول ہے''۔ اتنی ڈانٹ پڑی کہ کوئی حد نہیں۔ اچھی طرح یاد نہیں شاید تھپڑ بھی لگا۔ اور یہ ارشاد فرمایا کہ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حضور ﷺ نے امت کو ڈرانے کے واسطے جھوٹ بول دیا۔ کچھ سوچ کر بھی کہا حضور ﷺ جھوٹ بول سکتے ہیں تیرے ڈرانے کے واسطے؟'' اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ ''تشدید کی توجیہ احکام ہوا کرتی ہے، جیسا کہ شَارِبِ خمر کے بارے میں چوتھی مرتبہ پینے کی صورت میں قتل کا حکم ہے اور اسی قسم کے تشدیدی احکام اور اخبار کی حدیث میں تشدید نہیں ہوسکتی'' اسکے بعد جب کبھی اکابر شراح کے کلام میں اخبار کی حدیث میں تشدید کا لفظ دیکھتا ہوں تو ڈانٹ یاد آجاتی ہے۔

ان کو یہ بھی اہتمام تھا کہ شاگرد سے استاذ کی بے ادبی نہ ہو، میں نے چونکہ مشکوٰۃ

شریف اس طرز سے پڑھی جو اوپر گزرا اور مدرسہ کے اندر مشکوٰۃ اور حدیث کی کتب لمبی لمبی تقریروں سے ہوتی تھی، میں نے کئی دفعہ اجازت چاہی کہ حدیث کی فلاں کتاب کی سماعت کرلوں۔ بڑی شدت سے منع فرمایا کہ حدیث کی کتاب اپنے اور حضرت قدس سرہٗ کے علاوہ کسی سے نہیں پڑھنی، البتہ مَنْطِقُ وَنُطِق کی کتاب کسی اور سے پڑھے تو مضائقہ نہیں اور ارشاد فرمایا کہ ''تو چونکہ بے ادب گستاخ ہے، منطق فلسفہ وغیرہ کے اساتذہ میں سے اگر کسی کی گستاخی کرے گا تو وہ کتابیں جاتی رہیں گی، بلا سے جاتی رہیں لیکن حدیث کے اساتذہ میں سے اگر کسی کی تو نے گستاخی کی تو یہ گوارا نہیں کہ تیری حدیث ضائع ہو۔''

''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا''

گیارہواں واقعہ

(۱۱) یہ سارے افسانے خواب ہی ہوگئے اور یہ سارے مراحل والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ختم ہوگئے، اس کے بعد گویا نگرانی ختم ہوگئی۔ انتقال سے تقریباً ایک سال پہلے یا اس سے بھی کچھ زائد، حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ جن کا شدید اصرار والد صاحب کے بار بار بلانے پر رہتا تھا، ان کے خط کے جواب میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرے ہی قلم سے تحریر فرمایا کہ ''اب تک عزیز زکریا کی بیڑی میرے پاؤں میں ایسی زنجیر بنی ہوئی تھی کہ میں اس کی وجہ سے کہیں آجا نہیں سکتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب اس کی طرف سے اطمینان ہوگیا ہے۔

حضرتؒ کو چونکہ بہت اشتیاق رہتا تھا کہ والد صاحبؒ رائے پور طویل قیام کے لئے تشریف لے گئے اس ناکارہ نے ان کی تشریف بری کے بعد مکاری سے ان کی یاد اور ان کی غیبت سے اپنے نقصان کا اظہار کیا تو جواب میں تحریر فرمایا ''بڑوں کی نگرانی کی حاجت اس وقت تک رہتی ہے جب تک تعلق مَعَ اللہ پیدا نہ ہو، اور اس کے بعد ضرورت نہیں رہتی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کے فضل سے تمہارے اندر پیدا ہوگیا اب میری ضرورت نہیں رہی۔''

کاش اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم اور لطف واحسان سے والد صاحب کے اس حسن ظن کو ان کے بعد میرے دوسرے اکابر اور احباب واصاغر کے حسنِ ظن کو ''اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ'' کے عالی شان فرمان کے وجہ سے صحیح فرمادے تو اس کے لطف وکرم اور ان احساناتِ عظیمہ سے بعید نہیں جو ہمیشہ ہی میری ناپاکیوں کے باوجود رہے۔

فقط

یہ تو آپ کی سوانح کے صرف ایک باب پر تنقیدی استدراک تھا، اس کے علاوہ بھی کچھ نشانات سننے میں لگائے ہیں، ان کو بھی درج کرتا ہوں، تاکہ طبع ثانی میں ان کی رعایت ہو جائے۔

محمد زکریا

مظاہر علوم۔ سہارنپور

جمعہ۔ ۶/ شعبان ۸۷ھ

دوسرے نشانات چونکہ کتاب کی طباعت کے متعلق تھے اس لئے ان کی تصحیح کے لئے کتاب ہی بھیج دی گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اِن نینوں کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

عزیز مولوی محمد ثانی سلمہٗ کے پاس جو مضمون میں نے بھیجا تھا وہ صرف اوپر والا تھا۔ جب اس کی اشاعت کا خیال ہوا تو بعض دوستوں کا اصرار ہوا کہ میں نے چند روز ہوئے جو مضمون مدرسین و ملازمینِ مدرسہ مظاہر علوم کی خدمت میں بھیجا تھا وہ بھی اس کے ساتھ شائع ہونا ضروری ہے، مجھے بھی مناسب معلوم ہوا کہ اپنے ساٹھ سالہ قیام مظاہر علوم کے دوران جو کچھ دیکھا اور اکابر کے متعلق سُنا وہ بھی کچھ حذف و اضافے کے ساتھ اجمالاً دوستوں کے سامنے آجائے کہ یہ واقعات اب سے کچھ پہلے تو سب کو معلوم اور زبان پر جاری تھے مگر اب ان واقعات کے دیکھنے اور سننے والے بھی ختم ہوتے جارہے ہیں۔ آئندہ کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ اکابر کا معمول مدارس کے سلسلے میں کس قدر احتیاط اور شدت کا رہا۔ یہ ناکارہ طلب علم کے زمانے میں ۱۳۲۸ھ میں آیا تھا جب کہ میری عمر تیرہ سال سے کم تھی اور اب ربیع الآخر ۱۳۸۸ھ شروع ہوگیا، تقریباً ساٹھ سال اس مدرسہ کے اندر رہو گئے ہیں، دیکھا اور سنا تو بہت کچھ، اور ان سب کا احصاء دشوار بھی اور بڑی طویل کتاب چاہتا ہے، لیکن نمونہ کے طور پر چند واقعات اہلِ مدراس کی خدمت میں ضرور پیش کرنے کا دل چاہتا ہے کہ شاید کسی اللہ کے بندے کو ان اکابر کے اتباع کی توفیق نصیب ہوجائے۔ بہت اختصار کے ساتھ صرف نمونہ کے طور پر چند واقعات ذکر کرتا ہوں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کا مشہور مقولہ

(۱) قدوۃ الاتقیاء حضرت مولانا الحاج شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ سرپرست دارالعلوم دیوبند و مظاہر علوم سہارنپور کا یہ مقولہ بہت ہی مشہور تھا اور سنا بھی ہے کہ مجھے مدارس کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا کسی سے نہیں لگتا۔ اگر کوئی شخص کسی کے یہاں ملازم ہو وہ مالک کے کام میں کوتاہی کرے، خیانت کرے، کسی قسم کا نقصان پہنچائے، ملازمت سے علیحدہ ہوتے وقت یا مرتے وقت مالک سے معاف کرالے تو معاف ہوسکتا ہے لیکن مدرسوں کا روپیہ جو عام غرباء اور اور مزدوروں کے دو دو پیسے ایک ایک آنے کا چندہ ہوتا ہے ہم سب سرپرستانِ مدرسہ اس کے مالک تو نہیں، امین ہیں۔ اگر اس مال کے اندر افراط و تفریط ہو تو ہم لوگوں کے معاف

کرنے سے معاف تو ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہ دوسرے کے مال میں ہم کو معافی کا کیا حق ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ہم اگر بمصالح مدرسہ چشم پوشی کریں تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ ہم سے درگزر فرمالے۔ لیکن اگر اپنے ذاتی تعلقات سے ہم لوگ تسامح کریں تو ہم بھی جرم کے اندر شریک ہیں۔ لیکن جرم کرنے والے سے کسی حال میں بھی معاف نہیں ہوسکتا کہ حقوق العباد ہے اور جن کا مال ہے وہ اتنے کثیر ہیں کہ ان سے معاف نہیں کرایا جاسکتا۔

حضرت اقدس مولانا الحاج احمد علی صاحب کا کمال تقویٰ

(۲) حضرت اقدس شیخ مشائخ المحدثین مولانا الحاج احمد علی صاحب محدث سہارنپوری، بخاری، ترمذی کتب حدیث کے محشی اور مشہور عالم محدث ہیں۔ جب مظاہر علوم کی قدیم تعمیر کے چندہ کے سلسلے میں کلکتہ تشریف لے گئے تو وہاں مولانا کا اکثر قیام رہا ہے اور وہاں کے لوگوں سے وسیع تعلقات تھے تو مولانا مرحوم نے سفر سے واپسی پر اپنے سفر کی آمد وخرچ کا مفصل حساب مدرسہ میں داخل کیا تو وہ رجسٹر میں نے خود پڑھا۔ اس میں ایک جگہ لکھا تھا کہ کلکتہ میں فلاں جگہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ اگرچہ وہاں چندہ خوب ہوا لیکن میری سفر کی نیت دوست سے ملنے کی تھی چندہ کی نہیں تھی۔ اس لئے وہاں کی آمد ورفت کا اتنا کرایہ حساب سے وضع کرلیا جائے۔

(۳) حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی قدس سرہٗ (جو گویا مظاہر علوم کے بانی ہیں) کا یہ معمول میری جوانی میں عام طور سے مشہور اور لوگوں کو معلوم تھا کہ مدرسہ کے اوقات میں جب کوئی مولانا قدس سرہٗ کا عزیز ذاتی ملاقات کے لئے آتا تو اس سے باتیں شروع کرتے وقت گھڑی دیکھ لیتے اور واپسی پر گھڑی دیکھ کر کتاب میں ایک پرچا رکھا رہتا تھا اس پر تاریخ وار اُن منٹوں کا اندراج فرمالیتے تھے اور ۔ کے ختم پر ان کو جمع فرما کر اگر نصف یوم سے کم تو آدھ روز کی رخصت اور اگر نصف یوم سے زیادہ ہوتا تو ایک یوم کی رخصت مدرسہ میں لکھوادیتے۔ البتہ اگر کوئی فتویٰ وغیرہ پوچھنے آتا تھا یا مدرسہ کے کسی کام سے آتا تو اس کا اندراج نہیں فرمالیتے تھے۔

(۴) حضرت اقدس سیدی مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ جب یکسالہ قیام حجاز کے بعد آخر ۳۴ھ میں مظاہر علوم میں تشریف لائے تو میرے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا شروع ذیقعدہ میں انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت نے مدرسہ سے تنخواہ لینے سے یہ تحریر فرما کر انکار کردیا تھا کہ ”میں اپنے ضُعف وپیری کی وجہ سے کئی سال سے مدرسہ کا کام پورا نہیں کرسکتا لیکن اب تک مولانا محمد یحییٰ صاحب میری نیابت میں دورہ کے اسباق پڑھاتے تھے اور تنخواہ نہیں لیتے تھے وہ میرا ہی کام سمجھ کر کرتے تھے اور میں وہ دونوں مل کر ایک

مدرس سے زیادہ کام کرتے تھے، اب چونکہ ان کا انتقال ہو چکا ہے اور میں مدرسہ کی تعلیم کا پورا کام نہیں کرسکتا اس لئے قبولِ تنخواہ سے معذور ہوں۔'' اس پر حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے بڑی طویل تحریرات ہوئیں۔ حضرت رائپوری نے لکھا کہ آپ کے وجود کی مدرسہ کو سخت ضرورت ہے، آپ کے وجود سے مدرسہ کا سارا نظام باحسن وجوہ قائم ہے اس لئے آپ کو مدرسہ اب تعلیم کی تنخواہ نہیں دے گا بلکہ ناظم مدرسہ کی تنخواہ دے گا۔ حضرت کے مدرسہ میں تشریف نہ رکھنے سے مدرسہ کا نقصان ہے۔ حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے حضرت رائپوری کی بڑی تائید فرمائی۔ اس پر حضرت سہارنپوری نے تنخواہ لینی قبول فرمائی۔

حضرت سہانپوری کا تنخواہ سے انکار

اس سے قبل کا قصہ تو بہت مشہور ہے کہ حضرت سہارنپوریؒ کی تنخواہ چالیس روپے تھی اور عرصہ تک یہی رہی اور جب بھی ممبرانِ مدرسہ کی طرف سے حضرت کی ترقی کا مسئلہ پیش ہوتا تو حضرت ارشاد فرماتے کہ میری حیثیت سے یہ بھی زائد ہے۔ مگر جب ماتحت مدرسین کی تنخواہ چالیس تک پہنچ گئی تو ممبران نے اصرار کیا کہ آپ کی وجہ سے نیچے کے مُدَرِّسین کی ترقی رک جائے گی کہ صدر مدرس سے دوسروں کی تنخواہ بڑھ جائے اس پر حضرت نے اضافہ قبول فرمایا۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے متعلق بھی اس نوع کا قصہ معروف ہے کہ حضرت نے پچاس سے زیادہ کے اضافے کو قبول نہیں فرمایا۔ لیکن عرصہ کے بعد اسی اشکال کی وجہ سے حضرت نوراللہ مرقدہٗ نے اضافہ قبول فرمایا۔

مدرسہ کی اشیاء ذاتی استعمال کے لئے نہیں

(۵) میں نے خود تو یہ واقعہ نہیں دیکھا مگر دو (۲) واسطوں سے سنا ہے کہ حضرت اقدس سہارنپور کی خدمت میں ایک صاحب عزیزوں میں سے جو بڑے مرتبہ کے آدمیوں میں سے ملاقات کے لئے تشریف لائے، حضرت سبق پڑھا رہے تھے، اختتام سبق تک تو حضرت نے توجہ بھی نہ فرمائی۔ ختم سبق کے بعد حضرت ان کے پاس تشریف لائے، انہوں نے اصرار کیا کہ حضرت اسی جگہ تشریف رکھیں، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ مدرسہ نے یہ قالین اسباق پڑھانے کے لئے دیا ہے ذاتی استعمال کے لئے نہیں۔ اس لئے اس قالین سے علیحدہ بیٹھ گئے۔

البتہ یہ واقعہ میرا ہمیشہ کا دیکھا ہوا ہے کہ مدرسہ قدیم (دفتر مدرسہ) میں حضرت کی ہمیشہ دو (۲) چارپائی رہتی تھیں، ان ہی پر حضرت آرام فرماتے تھے ان ہی پر بیٹھتے تھے، مدرسہ

کی اشیاء کو میں نے استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

مہتمم نور مدرسین مظاہر جلسہ کے موقع پر بھی اپنے گھر سے کھانا کھاتے

(۶) مظاہر علوم کا جب سالانہ جلسہ ہوتا تھا، میں نے اکابر مدرسین وملازمین میں سے کبھی کسی کو جلسہ کے کھانے یا چائے یا پان کو کھاتے نہیں دیکھا۔ جملہ حضرات مدرسین اپنا اپنا کھانا کھاتے تھے جب بھی وقت ملے۔ البتہ حضرت قدس سرہٗ مدرسہ کے خصوصی مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے، لیکن حضرت کے مکان سے دس بارہ آدمیوں کا کھانا آتا تھا جو متفرق مہمانوں کے سامنے رکھ دیا جاتا تھا۔ اسی میں سے حضرت نوش فرماتے تھے۔ مدرسہ کی کوئی چیز کھاتے نہیں دیکھا۔ مولانا عنایت الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ دوشب وروز مدرسہ کے اندر رہتے اور ظہر کے وقت یا رات کے بارہ (۱۲) بجے اپنے دفتر کے کونے میں بیٹھ کر ٹھنڈا اور معمولی کھانا تنہا کھا لیتے تھے۔

مولانا ظہور الحق صاحب مدرس مدرسہ اس زمانے میں مطبخ طعام کے منتظم ہوتے تھے اور چوبیس گھنٹے مطبخ کے اندر رہتے تھے لیکن سالن چاول وغیرہ کا نمک کسی طالب علم سے چکھواتے تھے، خود نہیں چکھتے تھے۔ جب وقت ملتا اپنے گھر جا کر کھانا کھا آتے۔ اسی طرح سے دیگر اکابر مدرسین کو میں نے کوئی شے مدرسہ کی چکھتے نہیں دیکھا۔

ان سب احتیاطوں کے باوجود حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ جب ۴۴ھ میں مستقل قیام کے ارادہ سے حجاز تشریف لے گئے تو اپنا ذاتی کتب خانہ یہ فرما کر مدرسہ کے اندر وقف کر گئے تھے کہ نہ معلوم، مدرسہ کے کتنے حقوق ذمہ رہ گئے ہوں گے۔

(۷) میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے زمانے میں مدرسہ کا مطبخ جاری نہیں ہوا تھا نہ مدرسہ کے قریب کسی طباخ کی دوکان تھی، گھر والوں کے نہ ہونے کے زمانے میں جامع مسجد کے قریب ایک طباخ کی دکان تھی جس کا نام اسماعیل تھا۔ اس کے یہاں سے کھانا آیا کرتا تھا۔ سردی کے زمانے میں وہاں سے آتے آتے خصوصاً شام کو ٹھنڈا ہو جاتا تھا، تو سالن کے برتن کو مدرسہ کے حمام کے سامنے اندر نہیں بلکہ باہر رکھوا دیتے تھے، اس کی تپش سے وہ تھوڑی دیر میں گرم ہو جاتا تھا، تو یہ فرما کر دو تین روپے ہر ماہ چندہ کے اندر داخل فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کی آگ سے انتفاع ہوا ہے۔ تنخواہ تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے سات سالہ قیام مدرسہ میں کبھی لی ہی نہیں۔

حضرت مولانا عنایت الٰہی کے دو قلمدان اور پینشن کا واقعہ

(۸) حضرت مولانا الحاج عنایت الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ، اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، مدرسہ کے مہتمم بھی تھے، مفتی بھی تھے اور عدالتی تمام کاروبار ان ہی کے ذمہ تھے اور اس معنیٰ میں محصل چندشہر بھی تھے کہ محصل چندہ شہر جب کسی کے متعلق یہ کہتا کہ فلاں صاحب نے چندہ نہیں دیا، دومرتبہ جاچکا ہوں تو حضرت مہتمم صاحب اپنے گھر آتے جاتے اس کے گھر جاتے اور خوشامد فرماتے کہ تمہارا چندہ نہیں آیا۔ ان کی خوبیوں کا بیان تو اس مختصر تحریر میں نہیں آسکتا۔ لیکن دفتر کے اندران کے پاس دو قلمدان رہتے تھے، ایک ذاتی، ایک مدرسہ کا۔ ذاتی قلمدان میں کچھ ذاتی کاغذ رہتے۔ اپنے گھر کوئی ضروری پرچہ بھیجنا ہوتا تو اپنے قلمدان سے لکھتے، مدرسہ کے قلمدان سے کبھی نہیں لکھتے تھے۔ گرمیوں میں سات بجے کے قریب اور سردیوں میں آٹھ بجے کے قریب آتے اور عصر کے بعد واپس تشریف لے جاتے۔ ساری دوپہر کام کرتے اور آتے ہوئے اہلِ چندہ کے گھر ہوتے ہوئے آتے۔ لیکن حضرت سہارنپوری نوراللہ مرقدہٗ نے ایک مرتبہ دوسرے ملازمین کی ترقی کے ساتھ یہ کہہ کر ان کی ترقی روک دی تھی کہ مدرسہ کے اندر دیر میں تشریف لاتے ہیں۔ میں نے ہرچند عرض کیا کہ حضرت چھ گھنٹے سے زیادہ کام کرتے ہیں بار بار سفارش اور اصرار بھی کیا، لیکن حضرت فرماتے رہے کہ مدرسہ کے اوقات کی پابندی ملازم کے لئے ضروری ہے۔

(۹) حضرت مہتمم صاحب کی جدوجہد اور جانفشانی، ہمہ تن مدرسہ کے امور میں اشتغال اتنے کثیر واقعات ہیں جو اس قابل تھے کہ ان کی مکمل سوانح لکھی جاتی۔

آخر زمانۂ حیات میں امراض کی کثرت اور ضُعف کی وجہ سے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ حضرت مہتمم صاحب کی پینشن ہوجائے۔ مہتمم صاحب مدرسہ کے ابتدائی قیام کے وقت میں ابتدائی طالب علموں میں تھے، اس کے بعد مُعین مدرس ہوئے اور ترقی فرماتے فرماتے مدرس دوم تک جا پہنچے، دورے کے اسباق بھی اس زمانے میں مرحوم کے یہاں ہوئے۔ ۲۳ سے ھ سے باوجود مرحوم کے شدید انکار کے بضرورتِ مہتمم مقرر ہوئے اور اسی عہدے پر ۱۳۴۷ھ ۲۰ جمادی الثانیہ کو انتقال ہوا۔ غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ.

اخیر زمانہ میں ضعف و پیری کے علاوہ شدید امراض کا ابتلاء رہا۔ صبح کو ڈولی میں بیٹھ کر مدرسہ آتے اور بعد عصر ڈولی میں بیٹھ کر واپس تشریف لے جاتے۔ اس مشقت کو دیکھ کر مجھے ترس آتا تھا۔ میں نے تفصیلی حالات لکھ کر حضرات سرپرستانِ مدرسہ کی خدمت میں مرحوم کی خدماتِ جلیلہ کے پیش نظر خصوصی طور پر پنشن کی تجویز پیش کی تھی۔ حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سرپرست مدرسہ نے یہ تحریر فرمایا کہ ”مدرسہ کے موجودہ

چندہ سے پینشن جائز نہیں ہے، اس کے لئے آپ ایک مستقل مد قائم کر کے چندہ کریں، اس میں سے پینشن دی جاسکتی ہے، مہتمم صاحب کے متعلق جو لکھا وہ بالکل صحیح ہے، میں اس سے زیادہ واقف ہوں، ان کے لئے جو تم مناسب سمجھو تنخواہ تجویز کر کے مخصوص احباب سے چندہ مقرر کرالو۔ پانچ روپیہ ماہانہ میں اپنی ذات سے دوں گا۔"

حضرت سہانپوری کے اسباق کی نگرانی

(۱۰) حضرت سہارنپوری نوراللہ مرقدہٗ کو اس کا بہت اہتمام تھا کہ مدرسین اسباق کے اوقات کی بہت پابندی فرماویں۔ حضرت کا قانون یہ تھا کہ گھنٹے کے پانچ منٹ بعد فوراً سبق شروع ہوجائے، اس سے پہلے شروع نہ ہو اور گھنٹے سے پانچ منٹ پہلے ختم ہوجائے تاکہ طلباء کو ایک درس گاہ سے دوسری درس گاہ جانے میں دقت نہ ہو اور سبق کا حرج نہ ہو۔ اس کے خلاف اگر کسی مدرس کی شکایت ہوتی تو حضرت کے یہاں سے مدرس سے جواب طلب ہوتا۔ حضرت قدس سرہٗ کا رعب جملہ مدرسین پر اتنا زیادہ تھا کہ بجائے سخت لفظ کہنے کے صرف پوچھ لینا ہی مدرس کے لئے کافی تھا۔

حضرت نوراللہ مرقدہٗ کو اس کا بھی بہت اہتمام تھا کہ اسباق اعتدال سے ہوں۔ حضرت اس کے نہایت شدید مخالف تھے کہ شروع میں لمبی چوڑی تقریریں ہوں اور آخر میں کتاب رمضانی تراویح کی طرح سے جلدی جلدی پڑھائی جائے، اس کی شکایت پر بڑے سے بڑے مدرس کو بھی تنبیہ سے گریز نہیں فرماتے تھے۔ اسی نظریہ کے ماتحت اور حضرت قدس سرہٗ کے آخری سہ سالہ زمانۂ تعلیم کے نقشوں کے موافق وہ نقشۂ تعلیم تیار کیا گیا جو عرصہ سے مدرسہ مظاہر علوم میں معمول بہ ہے۔ حضرت نوراللہ مرقدہٗ کے یہاں تعلیم کی نگرانی کا بھی ایک خاص معمول تھا جب طلباء کی طرف سے کسی مدرس کی شکایت گزرتی تو حضرت قدس سرہٗ کی اپنی سہ دری میں جہاں حضرت تشریف فرما ہوتے تھے، عین سبق کے وقت مدرس کے پاس یہ پیغام پہنچتا کہ فلاں سبق گھنٹہ کے نیچے ہوگا۔ یہ ایک اصطلاحی لفظ اس زمانے میں بن گیا تھا، جس کی شرح یہ ہے کہ حضرت کہ سہ دری میں ایک گھنٹہ لٹکا ہوا تھا جو آج بھی ہے، مدرس گھنٹہ کے نیچے بیٹھتا اور طلباء جن کی جماعت اس وقت چھوٹی ہوتی تھی مدرس کے تینوں طرف، اور حضرت قدس سرہٗ اپنی جگہ حجرے کے سامنے تشریف فرما رہتے اور پورے گھنٹہ وہاں سبق ہوتا، اور حضرت ساکت سنتے رہتے، سبق کے بعد اس وقت حضرت کچھ نہ فرماتے۔ اس کے بعد اگر طلبہ کی شکایت صحیح ہوتی اور معمولی ہوتی تو مدرس کو تنبیہ فرماتے، اور اگر شدید ہوتی تو دو چار روز کے بعد وہ دوسرے مدرس کے یہاں منتقل کر دیتے۔ اور اگر طلبہ کی شکایت غلط ہوتی تو معمولی

سرغنوں کا کھانا بند اور اگر سخت ہوتی تو ان کا اخراج فرما دیتے۔ اس کا اثر ہمیشہ یہ رہا کہ مدرسین کو فکر رہتا کہ نہ معلوم سبق کب گھنٹہ کے نیچے پڑھانا پڑ جائے، اور طلبہ کو بھی شکایت کے اندر بہت غور و فکر کی ضرورت ہوتی، کہ اگر حضرت کے نزدیک شکایت غلط ہوئی تو کھانا بند ہو جانا معمولی بات ہے اور اخراج کا امکان۔

اس کے علاوہ حضرت قدس سرہٗ کا یہ بھی معمول تھا کہ خصوصی مہمانوں کو مدرسہ دکھلانے کے لئے خود تشریف لے جاتے، اور مہمان کو درس گاہ کے سامنے گشت کراتے ہوئے جس درس گاہ کے سامنے دل چاہے دس پندرہ منٹ کھڑے رہتے۔ اس ناکارہ کو گھنٹے والے قصے سے تو کبھی سابقہ نہیں پڑا، لیکن دوسرے مرحلے سے بارہا گزرنا پڑا۔ اس ناکارہ کو اپنی جوانی میں بخار وغیرہ امراض کی وجہ سے سبق ناغہ کرنے کی عادت نہیں تھی۔ ایک دفعہ مشکوٰۃ شریف کا سبق نہایت شدتِ بخار کے اندر پڑھا رہا تھا، مُصَرّاۃ کی بحث تھی اور میں اپنے بخار کے دوران میں زوروں پر تھا۔ اس زمانے کے سفیر ہند مقیم جدہ مدرسہ میں تشریف لائے حضرت ان کو مدرسہ دکھلانے خود تشریف لے گئے اور دار الحدیث کے سامنے جہاں مشکوٰۃ ہو رہی تھی تقریباً پندرہ منٹ سے زیادہ قیام فرمایا، مجھے حضرت کے کھڑا ہونے کا بالکل علم نہ ہو سکا، دفعۃً حضرت قدس سرہٗ پر نظر پڑی اور زبان لڑکھڑا گئی اور حضرت فوراً آگے بڑھ گئے۔ بعد میں طلباء نے بتایا کہ حضرت تقریباً پندرہ منٹ سے کھڑے تھے۔

اخبار بینی سے نفرت

(۱۱) اس ناکارہ کی ابتدائی مدرسی کے زمانے میں مظاہر علوم کا کوئی طالب علم اخبار دیکھنا جانتا ہی نہیں تھا۔ دار العلوم کے بھی دو چار طالب علموں کے علاوہ کوئی نہ جانتا تھا کہ اخبار کیا چیز ہے، اس زمانے میں ہم لوگوں کے تفریحی معمولات اکابرِ سلسلہ کی کتب بینی تھی۔ حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت سہارنپوریؒ، حضرت تھانویؒ کی تصانیف گویا ہم لوگوں کے لئے اخبار تھے۔ عام طور سے مدرسین اور اوپر کے طلباء کے شوق و ذوق ان اکابر کی کتابوں کا مطالعہ تھا۔

اب اس مبارک مشغلہ کے بجائے اخبارات، لغویات، دوستوں کا مشغلہ رہ گیا ہے۔

ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

صاحب کے طالب علمی کے واقعات

(۱۲) حضرت اقدس مولانا الحاج شاہ عبد القادر صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی

طالب علمی کے واقعات بہت ہی کثرت سے سنائے یہ ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ سردی میں کوئی کپڑا سردی کا نہیں تھا، کسی سے اظہار کو غیرت مانع تھی۔ اس کی انتہائی کوشش میں رہتا تھا کہ اس کی کسی کو خبر نہ ہو۔ جب تک مسجد کے کواڑ کھلے رہتے حمام کے سامنے سیکنے کے بہانے سے بیٹھا رہتا اور جب سب چلے جاتے تو مسجد کے اندر زنجیر لگا کر مسجد کی صف کے ایک کونے پر لپٹ کر کروٹیں بدلتا ہوا دوسرے کونے تک پہنچ جاتا، وہی صف اوڑھنا بچھونا بن جاتی تھی۔ سر اور پیروں کی طرف سے خوب ہوا لگتی رہتی تھی۔ تہجد کے وقت اسی طرح کروٹیں بدلتا ہوا دوسری جانب آجاتا صف بچھ جاتی۔ پھر ارشاد فرمایا وہ سردی تو گزر گئی لیکن اللہ کے فضل سے اس کے بعد کوئی سال ایسا نہیں گزرا کہ مالک کی طرف سے ایک دولحاف عمدہ ہدیہ کے اندر نہ آئے ہوں۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی طالب علمی کی جدوجہد اور رائپور کی ابتدائی حاضری کے واقعات اتنی کثرت سے سنائے کہ ان کے لکھنے کے واسطے بڑا دفتر چاہیے۔

حضرت نے ارشاد فرمایا کہ سہارنپور کی طالب علمی کے دور میں داخلہ بند ہو چکا تھا مطبخ تو مدرسہ کے اندر اس وقت تک قائم ہی نہیں ہوا تھا۔ طلبہ کو وظیفہ ملا کرتا تھا، دارالطلبہ بھی نہیں بنا تھا، اس لئے طلبہ کا قیام مساجد میں رہتا تھا۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ایک مسجد میں ہمارا پانچ آدمیوں کا قیام تھا، ایک طالب علم امام تھا، اس کا کھانا محلّہ سے آتا تھا، اور دو کا وظیفہ مدرسہ سے تھا، وہ اسباق سے فارغ ہونے کے بعد اپنی روٹی خود ہی پکایا کرتے تھے، کبھی دال بھی پکالی ورنہ چٹنی، تین آدمیوں کا کھانا ہم پانچ آدمی کھایا کرتے تھے۔ پیٹ صرف اس دن بھرتا تھا جب کہ محلّہ میں کسی جگہ دعوت ہوتی تھی یا جمعرات وغیرہ کو مسجد میں کوئی اور کچھ دے جائے ورنہ آدھی بھوک ہی اکثر کھانے کی نوبت آتی تھی۔

حضرت نے موجودہ طلباء کے ہنگاموں پر کئی مرتبہ ارشاد فرمایا کہ یہ تم لوگوں نے مطبخ جاری کر کے کیا ہے۔ دونوں وقت پکی پکائی بے فکری سے ملتی ہے، اس لئے کبھی روٹی کچی مل جاتی ہے، کبھی سالن ناپسند ہو جاتا ہے۔ ہم لوگوں کو اسباق کے بعد اس زمانے میں اپنی اپنی روٹی پکانے کی فکر پڑ جاتی تھی اپنے ہی ہاتھ سے طلبہ عام طور سے پکاتے تھے، کچی پکی جیسے پک جاتی تھی اسی کو غنیمت سمجھتے تھے، اپنی پکائی ہوئی ہوتی تھی اس میں عیب نہیں نکلتا تھا اب مطبخ سے پکی پکائی ملے ہے، سینکڑوں عیوب اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اور شکم سیر روٹی کھا کر لغویات کی سوجھے ہے، ہم لوگوں کو اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ خرافات کی سوجھے۔ حدیث پاک کے اندر بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

"اَلَا یُوْشِکُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ یَقُوْلُ عَلَیْکُمْ بِھٰذَا الْقُرْآنِ

فَمَاوَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ فَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ وَاِنَّمَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ." (الحدیث)

ترجمہ: "عنقریب ایک زمانہ آئے گا کہ ایک آدمی پیٹ بھرا اپنے مزین تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ بس قرآن پاک کو مضبوط پکڑو، ہم صرف اسی کو مانیں گے جو حلال وحرام قرآن میں ہے۔ حالانکہ اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ ایسی ہی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں۔" (مشکوٰۃ بروایت ابی داؤد)

ارشاد مبارک، ان لوگوں کے بارے میں ہے جو حدیث شریف کا انکار کرتے ہیں۔ اور حضور اقدس ﷺ نے سچ فرمایا کہ یہ ساری باتیں پیٹ بھرائی اور پیسے سے پیدا ہوتی ہے۔ فقر وفاقہ میں لغویات اور خرافات کی نہیں سوجھتی۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ اپنے رائپور کی حاضری کے ابتدائی دور کے قصے بھی بہت ہی لطف اور مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے، کیونکہ اپنے شیخ حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری قدس سرہٗ کے خادم خاص تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ قدس سرہٗ کو لٹانے کے بعد جب دوپہر کو حضرت آرام فرماتے تو میں کواڑ بند کر کے مہمانوں کو کھانے پکنے کی جگہ جاتا، معزالدین مرحوم جو بڑے حضرت کے مہمانوں کے کھانے پکانے کے منتظم تھے وہ سب مہمانوں کو کھلا کر مطبخ بند کر کے اپنے گھر چلے جاتے، میں وہاں جا کر دیکھتا کبھی ایک آدھ روٹی بچی ہوئی ہوتی، سالن کی دیگچیوں سے پونچھ کر کھالیتا اور کبھی کچھ بھی بچا ہوا نہیں ہوتا تھا تو سوکھے ہوئے ٹکڑے طاقوں وغیرہ میں رکھے ہوئے مل جاتے تھے ان کو پیالے میں ڈال کر پانی میں بھگو کر نمک ڈال کر اور اگر نمک نہ ملتا تو بغیر نمک ہی کے کھالیا کرتا تھا، کبھی پیٹ بھرتا کبھی نہ بھرتا کسی دوسرے سے تو کیا کہتا میں نے کبھی معزالدین مرحوم سے یہ بھی نہیں کہا کہ تم نے میرے واسطے روٹی نہیں رکھی۔ اور بھی اس قسم کے واقعات سنا کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کے خُدّام کے لئے اگر کھانا نہ بچے تو منتظم کی جان کو آجائیں۔

لکھنے کا واقعہ حضرت حاجی صاحب کا

(۱۳) میرے چچا جان مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے مجھے ایک مرتبہ کارڈ لکھا کہ کئی دن سے تم کو ایک ضروری خط لکھنے کا تقاضا تھا، مگر میرے پاس کوئی پیسہ نہ تھا، قرض لینے کو دل نہ چاہا۔ آج اللہ نے پیسے عطا فرمائے ہیں تم کو خط لکھ رہا ہوں۔

اور سید الطائفہ حضرت الحاج مولانا امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک قصہ تو مشہورِ عالم ہے کہ مکہ مکرمہ میں کئی دن کے فاقوں کے بعد ایک ایسے مخلص دوست سے جس سے بڑے

تعلقات بھی تھے دو ہلل قرض مانگے تھے اس نے عذر کر دیا، اس پر حضرت کو بہت ہی رنج و قلق ہوا کہ کیوں مانگے تھے۔ اس کے بعد حضرت قدس سرہٗ نے خواب میں دیکھا کہ ابتلاء کا دور ختم ہو گیا اب فتوحات کا دور ہے، پھر جو فتوحات ہوئیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ ہم لوگوں سے ذرا بھی تکلیف برداشت نہیں ہوئی۔

(۱۴) یہ واقعہ جو آگے لکھوا رہا ہوں میرے سامنے کا تو نہیں ہے مگر میرے ایک عزیز مرحوم نے کئی بار سنایا کہ وہ دہلی کی کسی مسجد میں امام تھے اور چچا جان قدس سرہٗ کا ابتدائی دور تھا، وہ ایک مرتبہ رمضان میں یہ سمجھ کر کہ چچا جان دلی کے پیر ہیں رمضان میں بہت فتوحات ہوتی ہوں گی وہ ظہر کے بعد عصر کے وقت نظام الدین پہنچے۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا معمول عصر کے بعد سے مغرب تک ذکر بالجہر کا تھا، عین افطار کے وقت خُدّام سے پوچھتے کہ کوئی چیز افطاری کو ہے؟ جو حاضر ہوتا خُدّام پیش کر دیتے اور جو کچھ کھانا ہوتا مغرب کے وقت ہی نوش فرما لیتے، وہی افطاری ہوتی اور وہی افطاری کے بعد کا کھانا۔ جب افطار کا وقت ہو گیا اور چچا جان نے حسبِ معمول پوچھا کہ لاؤ بھائی کچھ ہے کسی نے کہا کہ حضرت کچھ اور تو ہے نہیں کل کے گولر بچے ہوئے ہیں۔ چچا جان نے فرمایا کہ واہ وا، واہ واہ ضرور لاؤ میرے عزیز بھی شریک ہو گئے چچا جان نے چار پانچ گولر کھا کر اور پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا، مغرب کی نماز پڑھائی اور نفلوں کے اندر مشغول ہو گئے۔ عشاء کی اذان تک حسب معمول نفلیں پڑھتے رہے، اذان کے قریب فارغ ہو کر تھوڑی دیر لیٹے، پھر عشاء اور تراویح بڑے اطمینان سے پڑھائیں۔ وہ غریب عزیز سوچتا ہی رہا کہ کھانے کا نمبر کب کو آئے گا۔ نظام الدین رکے رہنے والے طلباء اپنا کھانا خود پکاتے تھے اور پکانے کے بعد ایک ایک دو دو روٹی ان کو تقسیم ہو جاتی تھی، وہ اپنے ہاتھ پر رکھ کر کھا لیتے تھے، چچا جان کو تو کیا احساس ہوا ہو گا مگر ان عزیز نے رات بڑی مشکل سے گزاری۔ سحر کے وقت پھر وہی افطاری والا منظر تھا اور وہی گولروں کا لوٹا تھا اور وہی سحری اور وہی شکر۔ صبح کی نماز کے بعد اس عزیز نے دلی آنے کی اجازت چاہی۔ چچا جان بہت ہنسے اور فرمایا کہ بالکل اجازت نہیں ہے۔ اس نے اپنی ضروریات کا بہت اظہار کیا مگر انہوں نے منظور نہیں فرمایا۔ غریب نے سارے دن روزہ پر روزہ چند گولروں کے سحر و افطار کے ساتھ رکھا تھا، کہا کرتا تھا کہ جو کچھ میرے اوپر گزری تھی میں ہی جانتا تھا۔ دوسرے دن عصر کے بعد وہی ذکر کا منظر تھا اور مرحوم عزیز کہا کرتا تھا کہ میری جان کو بن رہی تھی کہ اب پھر وہی گولر آئیں گے۔ قُبَیْلَ الْمَغْرِب دہلی سے ریڑھی پر رکھی ہوئی نہایت لذیز مرغن بریانی کی ایک دیگ آئی جس کی خوشبو سے ساری مسجد مہک رہی تھی۔ چچا جان نے افطار کے وقت فرمایا کہ "آؤ بھائی لطیف! یہ بریانی تمہارے ہی واسطے آئی ہے۔" مرحوم کہا کرتا تھا کہ دوسرے دن افطار و سحر میں

اتنی رغبت اور لذت سے پیٹ بھر کر کھائی کہ عمر بھر یاد رہے گی۔

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کا طالب علمی کے زمانے میں صرف روٹی بغیر سالن کے کھانے

(۱۵) میری دادی کے نانا حضرت مولانا مظفر حسین صاحب قدس سرہٗ کے نام نامی سے ابھی تک ہندو پاک کے ہزاروں آدمی واقف ہیں، ان کی طالب علمی کا ابتدائی دور دہلی میں گزرا، بازار سے کھانا خرید کر کھایا کرتے تھے لیکن صرف روٹی خریدتے تھے، سالن کبھی نہیں خریدتے تھے اور بغیر سالن کے خشک روٹی کھایا کرتے تھے، اس لئے کہ اس زمانے میں دہلی کی دکانوں میں جو سالن پکتا تھا اس میں اچور کا ڈالنا لازم تھا، اور فرمایا کرتے تھے کہ آموں کے باغوں کی بیع قبل از بدوّ صلاح ہوتی ہے جو جائز نہیں ہے، اس لئے سالن سے کبھی روٹی نہ کھاتے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ کسی مشتبہ مال کو حضرت مولاناؒ کا معدہ قبول نہیں کرتا تھا، اگر کسی جگہ غلطی سے بھی مشتبہ مال کھانے کی نوبت آجاتی تو فوراً قے ہو جاتی تھی۔ بہت سے واقعات اس سلسلہ کے حضرت مرحوم کے مشہور و معروف ہیں۔ حضرت مرحوم کے کچھ حالات ''تذکرۃ الخلیل'' میں، جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کی سوانح ہے، جس میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب، حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری، حضرت شیخ الہند، مولانا محمود الحسن صاحب اور میرے والد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی خلیفہ حضرت گنگوہی قدس سرہم کے حالات بھی مختصر طور پر ذکر کئے گئے ہیں مذکور ہیں۔ ان بزرگوں کے حالات نیز حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی قدس سرّہما، حضرت شیخ الہند، حکیم الامت مولانا تھانوی نور اللہ مراقدہم کی سوانح مستقل شائع ہو چکی ہیں جن سے ان حضرات کے مجاہدات، تقویٰ و طہارت، دنیا سے بے رغبتی، آخرت کے اندر ہمہ تن مشغولی مفصل موجود ہے۔ احباب کو ان کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، ان اکابر کے حالات سے سبق لینا چاہیے کہ دنیا کی زندگی چاہے جتنی بھی زیادہ ہو جائے بہر حال ختم ہونے والی ہے، موت سے کسی کو چارہ نہیں ہے، اور آخرت کی زندگی دائمی ہے کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ سمجھ دار اور عقلمند کا کام ہے دائمی زندگی کے لئے جو کچھ کر سکتا ہو کر لے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''خدا کی قسم! میں تم لوگوں پر فقیر کا اندیشہ نہیں کرتا، مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ دنیا تم پر پھیل جائے گی جیسا کہ پہلوں پر پھیل چکی ہے اور تم اس میں دل لگا بیٹھو گے جیسا کہ وہ لوگ لگا بیٹھے ہیں اور یہ دنیا تم کو بھی ایسے ہی ہلاک کر دے گی جیسے ان لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔''

(مشکوٰۃ بروایت شیخین)

ان حضرات اکابر نے حضور ﷺ کے پاک ارشادات کو دل میں جگہ دے رکھی تھی اور ان پر عمل کر کے دکھلا دیا۔ ہم لوگوں کو نہ حضورِ اقدس ﷺ کے ارشادات پر عمل کی توفیق، نہ ان اکابر جن کے ہر قول و فعل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، کے اتباع کی امنگ اور شوق۔

فالی اللہ المشتکیٰ.

اُولٰئِکَ اٰبَائِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِهِمْ
اِذَا جَمَعَتْنَا یَا جَرِیْرُ الْمَجَامِعُ

خدا یاد آئے جن کو دیکھ کر وہ نور کے پتلے
نبوت کے یہ وارث ہیں یہی ہیں ظلِّ رحمانی
یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر
انہیں کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی
انہیں کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے
انہیں کا کام ہے دینی مراہم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں
پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزہ آئے
اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

لکھنے کو بہت جی چاہتا ہے مگر اس کے لئے تو بڑے دفتر چاہیں، نمونہ کے لئے یہ بھی کافی ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

فقط
محمد زکریا
مظاہر علوم سہارنپور
۱۵ ربیع الآخر ۸۸ھ

اضافات برحواشی وغیرہ

یکم شعبان المعظم ۱۳۹۶ھ جمعۃ المبارک

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ

آپ بیتی نمبر ۲

(یا)

یادِ ایام نمبر ۱

جس میں

حضرت اقدس شیخ الحدیث، عارف کبیر

مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ، کے طفولیت

تعلیم، تدریس، تالیف کے حالات

تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں

مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴، کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نَحمَدُہ وَنصُلّیُ عَلیٰ رَسُولِہ الکَرِیم

یہ رسالہ جیسا کہ اس کی تمہید سے معلوم ہوگا آپ بیتی نمبر۲ تجویز تھا اور لکھتے وقت ابتداء خیال یہی تھا کہ جس طرح اس کے حصہ نمبر۱ کے درمیان مختصر اُواقعات آئے ہیں ایسے ہی اس میں بھی آجائیں گے، اور اسی کے برابر آپ بیتی نمبر۲، ونمبر۳ میں علی گڑھ کے قیام میں جتنے واقعات متفرق یاد آتے رہیں گے لکھواتا رہوں گا۔ مگر اس کے شروع ہی میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مضامین کو الگ الگ فصول اور ابواب میں تقسیم کر دیا جائے اور شروع ہی میں آٹھ باب ذہن میں آگئے تھے اور علی گڑھ کے چند روزہ قیام میں آٹھوں بابوں پر کچھ اجمالی اور کچھ تفصیلی واقعات لکھے جا چکے تھے یہاں آکر جب اس کو صاف نقل کرایا تو وہ مستقل ایک طویل رسالہ بن گیا۔ اس لئے متعدد دوستوں بالخصوص مولوی عبدالرحیم متالاسلمہٗ کا اصرار ہے کہ اس کو اول کا جُزنہ بنایا جائے بلکہ اس کو مستقل ایک رسالہ یادِ ایام کے نام سے شائع کرایا جائے کہ اس کے مضامین اول سے بہت مختلف ہیں۔

اس لئے اس کا نام آپ بیتی نمبر۲ یا یادِ ایام نمبر۱ سے موسوم کرتا ہوں اور چونکہ یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اس لئے خیال ہے کہ ہر نمبر میں دو دو باب آجائیں گے جو معتدل اور مناسب رسالوں کی شکل میں شائع ہو سکیں گے۔

فقط والسلام

محمد زکریا کاندھلوی

۱۵ شعبان المعظم ۱۳۹۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

بابِ اول

اعمال کا مدار نیتوں پر ہے

﴿فَاعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّین﴾ ﴿لَنْ یَّنَالَ اللّٰہ لُحُوْمُھَا وَلَادِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ﴾ ”اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ ، وَاِنَّمَا لِامْرِیءٍ مَانَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصیبھا اَوْاِلَی امْرَاۃٍ یَنکِحُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَاھَا جَرَ اِلَیْہِ.“

ترجمہ: اللہ جل شانہٗ کا پاک ارشاد ہے کہ ”اس کی عبادت اخلاص کے ساتھ کرو اور یہ کہ اس کے پاس قربانی کا گوشت یا اس کا خون نہیں پہنچتا، بلکہ اس کے پاس تقویٰ اور پرہیز گاری پہنچتی ہے۔“

اور حضور ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ ”اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی وہ نیت کرے۔ جس کی ہجرت اپنی نیت کے اعتبار اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہوگی۔ اللہ کے نزدیک اور مال کے اعتبار سے بھی اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا یا کسی عورت سے نکاح کی غرض سے ہوگی اس کی ہجرت بھی اسی کی طرف سے ہوگی جس کی نیت کی ہو۔“

یہ حدیث پاک بڑی جامع ہے۔ بعض علماء نے اس حدیث کو آدھا علم کہا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک تو تصوف سارا کا سارا یہی ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

حدیث پاک میں دو جملے ارشاد فرمائے گئے ہیں کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی نیت کرے۔ دوسرا مرحلہ پہلے کی تائید بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ اکثروں نے کہا ہے اور مستقل دوسرا مضمون بھی ہوسکتا ہے اور یہ زیادہ اچھا ہے اور وہ یہ کہ

آدمی کسی نیک کام میں جتنی نیتیں کرلے اللہ تعالیٰ سب ہی کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ مولانا نواب قصب الدین صاحب نے مظاہر حق میں اس کی بہت سی مثالیں لکھی ہیں۔ مثلاً مسجد کے جانے میں بہت سی نیتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ نیت اعتکاف کی کرے اور اس کے ساتھ اس کی بھی نیت کرے کہ رب کریم کے گھر حاضری ہے اور کریم اپنے یہاں آنے والوں کا اکرام کرتا ہی ہے۔ اسی سے نماز کے انتظار میں جتنی دیر بیٹھے گا اس کا مستقل ثواب ہوگا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص نماز کے انتظار میں رہتا ہے وہ نماز ہی میں رہتا ہے اور یہ کہ اس مقام پر آنکھ، کان اور دیگر اعضاء کی معاصی سے حفاظت کا مقام ہے کہ بازار وغیرہ میں یہ سب اعضاء کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا رہتے ہیں، ان سے حفاظت کی نیت کرے کہ اس کا مستقل ثواب ہوگا اور یہ نیت کرے کہ اس پاک جگہ میں دعا درود پڑھتا رہوں گا اس کا مستقل ثواب ہے اور یہ نیت بھی کرلے کہ یہاں یکسوئی اور کمال تَوَجُّہ اِلَی اللہ نصیب ہوگی جس کا مستقل ثواب ہے۔ اور یہ بھی نیت کرلے کہ وضو کرکے نماز کے لئے جانے کا ثواب حج اور عمرہ کا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی نیت کرلے کہ اَمر بالمعروف، نہی عنِ المنکر اور علم حاصل کرنا اور علم سکھانا مجمع کی وجہ سے مسجد میں میسر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی نیت کرے کہ مسلمانوں سے ملاقات ہوگی کہ مستقل عبادت ہے۔ اور انہیں سلام کرنے کا موقع ملے گا۔ اور آخرت کے امور میں اللہ کی بارگاہ میں مُراقبہ اور فکر کا موقع ملے گا۔ اور اسی طرح سے بہت سے امور پیدا ہوسکتے ہیں۔ اور جتنے امور کی آدمی نیت کرلے گا ان کا مستقل ثواب ملے گا۔ مالک کے یہاں عطا میں کوئی کمی نہیں ہے ؎

تو وہ داتا ہے کہ دینے کے لئے
درتری رحمت کے ہیں ہردم کھلے

تقریباً تین سال ہوئے عزیز مولوی سید محمد ثانی ندوی لکھنوی نے عزیز گرامی قدر و منزلت مولانا الحاج محمد یوسف صاحبؒ کی سوانح لکھی تھی، اس کا ایک باب اس سیہ کار کے متعلق تھا، مکرم محترم مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں صاحب نے خود اپنے دستِ مبارک سے لکھا تھا۔ ساری کتاب کا مسوّدہ تو طباعت سے پہلے وقتاً فوقتاً مجھے دکھایا گیا، لیکن اس باب کا مجھ سے اخفا کیا یا جو طبع ہونے کے بعد دیکھا جس پر میں نے عزیز مولوی محمد ثانی سلمہ کو لکھا کہ تم نے اس باب کا اضافہ کرکے ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگا کر ساری کتاب ہی کو بدنما کردیا۔ اور میں نے اس پر تنقید کے طور پر ایک خط لکھا، جس میں لکھا کہ جو باتیں لکھنے کی تھیں وہ تو آپ نے لکھی نہیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں وہ بھی مختصر اور اجمال کے ساتھ۔ اور

میں نے چند واقعات جو میرے نزدیک قابلِ تحریر تھے لکھ کر عزیز موصوف کو دیئے، جن کو سن کر بعض دوستوں کا اصرار ان کی طباعت پر ہوا۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ مستقل چھپتی لیکن دوستوں کے شدید اصرار پر میں نے دو سال ہوئے اسے اپنے رسالہ اسٹرائک کا جُز بنا کر آپ بیتی کے نام سے شائع کر دیا۔

اس وقت سے دوستوں کا برابر تقاضا ہے کہ وہ بہت مختصر ہے، اس پر کچھ مزید اضافہ ضرور کیا جائے؛ بالخصوص گزشتہ سال سفر حجاز سے واپسی میں رائے ونڈ کے طلباء عزیز نے تو بہت ہی زیادہ اصرار کیا اور یہ بھی بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اس رسالہ کو اساتذہ سے سبقاً سبقاً بار بار پڑھا اور ان کے اساتذہ نے بھی اس کی تصدیق وتوثیق کی۔ لیکن یہ کوئی علمی مشغلہ نہیں تھا، جس کے لئے بہر حال وقت نکالنا ضرور ہوتا کہ مجھے اپنی آنکھوں کی معذوری کے باوجود رسالہ ''جزاالحج والعمرۃ'' کا زیادہ اہتمام ہو رہا تھا اور اسے اکثر اوقات پڑا پڑا سنتا تھا کہ مجھے ۱۰ جمادی الثانی ۹۰ھ مطابق ۲۲ اگست، ۷۰ء کو علی گڑھ کے ہسپتال میں اپنی آنکھ کے علاج کے سلسلے میں دوبارہ جانا پڑا کہ پہلی مرتبہ ۲۹ ذی الحجہ ۸۹ھ مطابق ۸ مارچ ۷۰ء کو آپریشن کے لئے جانا ہوا تھا اور ۱۴ مارچ کو اپریشن ہوا تھا، لیکن اس وقت تو بات کرنے کی اور خط وکتابت کی بھی ممانعت تھی، مگر آنکھ میں صفائی نہ آنے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ تین دن کے لئے بلایا تھا کہ تین دن کے معائنہ کے بعد وہ بتلائیں گے کہ مزید قیام کی ضرورت ہے یا نہیں؟ چنانچہ ڈاکٹروں نے، اللہ ان سب ہی کو جزائے خیر دے، تین چار دن تک ہر جزء بدن کے معائنے کئے بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے دس بارہ دن یہاں قیام کرنا ضروری ہے، ان ایام میں خالی پڑے پڑے مجھے خیال ہوا کہ دوستوں کی اس فرمائش کو پورا کر دوں اور جو کچھ ان ایام میں ہو سکے ان کو لکھ کر آپ بیتی نمبر ۲ بنا دوں، پھر اگر کبھی مقدر میں ہوا تو نمبر ۳ کی بھی گنجائش ہے۔ اس لئے آج ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳۹۰ھ بمطابق ۲۶ اگست ۷۰ء چہار شنبہ کو بسم اللہ کرا دی۔

چونکہ ہر ایک گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد ڈاکٹروں کی آمد ہوتی ہے اور انجکشنوں اور معائنوں کا سلسلہ رہتا ہے اس لئے مسلسل وقت ملنا تو یہاں بھی دشوار ہے تاہم چونکہ یہ خیال ہے کہ خبر نہیں یہاں کتنا قیام ہے اس لئے جو وقت بے کار جائے اس میں کوئی کام کی چیز آجائے۔

اگرچہ ڈاک نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، کل ایک مہمان جو سہارنپور سے آئے ہیں وہ ایک دن کی ڈاک باون (۵۲) خطوط ہندی، پاکی، مکی، مدنی، لندن، افریقی وغیرہ

لے کر آئے ہیں، جن کے سننے میں بھی کئی دن لگیں گے اور آج رات کو ایک اور صاحب آرہے ہیں، دیکھئے وہ کتنے خط لاویں۔ اس کے باوجود جتنا بھی وقت ملتا رہا دن میں اور رات میں اس کا مسودہ لکھا گیا۔ چونکہ رات کو نیند بہت کم آتی تھی اس لئے رات کو وقت زیادہ ملتا تھا اللہ تعالیٰ دوستوں کو جزائے خیر دے کہ وہ بھی میری وجہ سے اپنی نیند ضائع کرتے تھے۔

وہاں کے اٹھارہ روز کے قیام میں جو اس کی ابتداء کے بعد سے ۱۳ ستمبر تک ہوئے، آٹھ بابوں کا مسودہ تقریباً تیار ہو گیا، جن میں سے بعض ابواب کے مضامین تو پورے آگئے اور بعض ابواب کے مضامین بطورِ فہرست جو یاد آتے رہے وہ لکھے گئے، تکمیل سہارنپور آنے کے بعد ہوئی۔

ان میں سب سے پہلا باب ''حسنِ نیت'' کے متعلق ہے۔ دوسرا ''درس وتدریسِ مظاہر علوم وتالیفات'' کے متعلق ہے۔ تیسرا ''اپنی چند بری عادتوں کا بیان'' ہے۔ چوتھا جو درحقیقت تیسرے باب ہی کا جز ہے ''حوادث اور شادیوں میں اپنا معمول''۔ پانچواں ''تحدیث بالنعمۃ'' ہے۔ چھٹے میں ''اپنے حجوں کی کچھ تفصیلات''، جو درحقیقت میں پانچویں ہی باب کا جز ہے۔ ساتواں باب ''تقسیم ہند'' اور آٹھواں باب ''متفرقات''۔ ان میں بعض اجمالاً اور بعض تفصیلاً علی گڑھ میں لکھے جا چکے تھے، شاید کبھی موقع ہو تو ان پر اضافہ بھی ہو جائے۔

پہلا باب جس کے متعلق قرآن پاک کی دو آیتیں اور ایک حدیث پاک بھی لکھی جا چکی ہے وہ ایمان واسلام، احسان وسلوک سب ہی لُبِّ لُباب ہے اور خلاصہ ہے۔ چند واقعات اس سلسلے میں یاد آگئے۔

حضرت مولانا حبیب صاحب کا سوال اور بندہ کا جواب

حقیقت تصوف کے بارے میں

(۱) مولانا حبیب الرحمٰن رئیس الاحرار کے دیکھنے والے تو ابھی بہت ہوں گے اور نام سننے والے تو بہت زیادہ۔ مُنتہاء میں تو مرحوم کو مجھ سے بہت زیادہ محبت ہو گئی تھی اور تعلق اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ وہ بجائے دہلی کے سہارنپور میرے پاس رہنے کی تمنائیں بڑی کثرت سے کیا کرتے تھے بلکہ اصرار بھی، اور میں اپنے بے کار اور ان کے باکار ہونے کی وجہ سے اس کو کبھی قبول نہیں کرتا تھا۔ لیکن ابتداء میں میرے اور مرحوم کے تعلقات بہت ہی خراب

تھے۔ان کا تو مظاہر میں کبھی ان زمانے میں آمد نہیں ہوتی تھی۔لیکن مجھے دیوبند کبھی کبھی حضرت قدس سرہٗ کا فرستادہ بن کر کتب خانے سے کسی کتاب کی تلاش میں یا محترمین مہتمین رحمہم اللہ تعالیٰ سے کسی بات پر مشورہ کے لئے جانا ہوتا تھا۔ایک بجے والی سے جانا ہوتا تھا اور ہمروزہ واپسی کے ارادہ سے جانا ہوتا تھا۔

رئیس الاحرار صاحبؒ مجھ سے بہت واقف تھے کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں۔مدرسہ کا مدرس ہوں اور میں ان سے صرف اتنا واقف تھا کہ لُدھیانہ کا کوئی طالب علم جس کو پڑھنے پڑھانے سے کوئی تعلق نہیں لیڈری کرتا تھا، وہ چونکہ گھومتے رہتے تھے اس واسطے میری دیوبند کی ہر مرتبہ کی آمد پر دو تین مرتبہ ان کا سامنا ہوتا اور وہ بہت ہی چلا کر مجھے سنا کر بہت ناراضی کا اظہار کیا کرتے تھے، اس لئے کہ انہیں معلوم تھا کہ میں سیاست سے بالکل بے تعلق، اخبار بینی کا دشمن ہوں اور اس زمانے میں دیوبند، سہارنپور میں اخبار بینی آئی بھی نہیں تھی۔سہارنپور کا کوئی طالب علم یا مدرس تو اخبار بینی جانتا ہی نہ تھا کہ کیا بلا ہے۔حضرت قدس سرہٗ کی چارپائی پر عصر کے بعد دو چار اخبار پڑے رہتے تھے جن کو کوئی باہر کا مہمان اٹھا کر دیکھ لیتا تھا۔دیوبند میں مولانا اعزاز علی صاحبؒ اور ان کے ہمنوا تو نہایت مخالف اور اخبار بینی کے دشمن۔لیکن مولانا شبیر احمد عثمانیؒ وغیرہ مدرسین کوئی ایک آدھ دیکھ لیتا تھا۔رئیس الاحرار صاحب مرحوم جب مجھے دیکھتے، دور سے چلا کر کہتے ''ایسے شخص کا وجود زمین پر بوجھ ہے، یہ مر کیوں نہیں جاتے، ان کے لئے زمین کا اندرون زمین کے بیرون سے بہتر ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔اور اس ناکارہ کی اتنی جرأت تو نہیں ہوتی تھی کہ پکار کر کچھ کہتا۔مگر ایک دو طالب علم جو مجھے دیکھ کر میرے ساتھ ہو لیتے تھے ان سے پیاماً کہلوا دیتا تھا کہ ''اس شخص کو مدرسہ کی روٹی کھانا حرام ہے، مدرسہ کا چندہ لیڈری کے واسطے نہیں آتا۔جس شخص کو پڑھنے پڑھانے سے کوئی واسطہ نہ ہو، مطالعہ سبق سے کوئی کام نہ ہو اس کو مدرسہ کی روٹی کھانا حرام ہے۔مدرسہ کے اندر قیام ناجائز ہے۔مدرسہ کی ہر قسم کی اعانت حاصل کرنا گناہ ہے'' وغیرہ وغیرہ۔اس پیام پر مرحوم اور بھی زیادہ برافروختہ ہوا کرتے۔کئی سال یہی قصہ رہا۔

مگر اللہ جل شانہٗ نے مرحوم کی دستگیری فرمائی کہ اعلیٰ حضرت قدوۃ الاتقیاء فخر الاولیاء حضرت مولانا الحاج شاہ عبدالرحیم رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے اخیر زمانۂ حیات میں حضرت قدس سرہٗ سے حضرت الحاج شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے کہ اس زمانے کا دستور یہی تھا کہ اعلیٰ حضرت سے جو شخص بیعت ہونا چاہتا تھا، ضعف و نقاہت کی وجہ سے حضرت خود تو نہ فرماتے تھے، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب

نوراللہ مرقدہٗ بیعت کے الفاظ کہلا دیتے تھے۔ بڑوں کے ہاتھ میں ہاتھ دینا اثر سے خالی نہیں جاتا۔ چنانچہ یہ تعلق رنگ لائے بغیر نہیں رہا اور اخیر میں تو رئیس الاحرار کو حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے عشق کا تعلق ہوگیا تھا اور حضرتؒ کی وجہ سے اس سیہ کار سے بھی۔ لیکن شروع کے چند سال ایسے گزرے کہ مرحوم اپنی سیاحت میں رہتے۔ کلکتہ بمبئی اور پشاور وغیرہ ان کی روزمرہ کی گزرگاہ تھی اور سہارنپور ہر جگہ کا جنکشن۔ اس لئے جب سہارنپور سے گزر ہوتا تو ہمروز واپسی یا ایک شب قیام کے لئے رائے پور بھی جاتے۔

اس کے دیکھنے والے تو آج بھی سینکڑوں ہیں کہ حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحبؒ کو اس سیہ کار کے ساتھ عشق کا سا تعلق تھا، جملہ معترضہ کے طور پر ایک واقعہ لکھتا ہوں کہ میرے مخلص دوست صوفی اقبال پاکستانی ثم المدنی جو پاکستان میں ملازم تھے جب حضرت رائے پوریؒ پاکستان جاتے اور صوفی اقبال مجھے خط لکھتے تو بہت اصرار سے مجھے لکھا کرتے کہ میرے خط کے جواب میں حضرت رائے پوری کو سلام ضرور لکھ دیجیو۔ اس لئے کہ جب میں عصر کے بعد کی مجلس میں یوں کہہ دیتا ہوں کہ شیخ کا خط آیا ہے حضرت کو سلام لکھا ہے تو فوراً چارپائی کے قریب بلایا جاتا ہوں اور فوراً خیریت وحالات وغیرہ دریافت کرنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے مغرب تک چارپائی کے قریب بیٹھنا نصیب ہوجاتا ہے۔

اس تعلق کی بناء پر جب کوئی شخص رائے پور حاضر ہوتا تو حضرت کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ شیخ سے مل کر آئے یا نہیں؟ اگر وہ کہتا کہ مل کر آیا ہوں تو بڑی بشاشت سے بات پوچھتے، خیریت پوچھتے، کیا کر رہے تھے؟ کوئی پیام دیا وغیرہ وغیرہ، اور اگر وہ کہتا کہ نہیں مل کر آیا تو زیادہ التفات نہ فرماتے، بلکہ جیسا تعلق ہوتا ویسا ہی برتاؤ کرتے۔ اس مجبوری کو بہت سے ایسے لوگ جن میں رئیس الاحرار بھی تھے باوجود دل نہ چاہنے کے نہایت گرانی کے ساتھ کھڑے کھڑے مصافحہ کرنا ضروری سمجھتے تاکہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ہو کر آیا ہوں اور سلام عرض کیا ہے اور میں بھی اس قسم کے لوگوں سے باوجود جی نہ چاہنے کے چاہے کتنی ہی مشغولی کا وقت ہو اور کتنا ہی ضروری کام کر رہا ہوتا ضرور بلا کر حضرت کی خدمت میں سلام عرض کردیتا۔ مبادا وہ جا کر کہہ دیں کہ میں تو حاضر ہوا تھا باریابی نہ ہوئی۔

رئیس الاحرار مرحوم سے کئی سال سے صرف اس نوع کی ملاقات رہی۔ ایک مرتبہ ۱۰ بجے صبح کو میں اوپر اپنے کمرے میں نہایت مشغول تھا، مولوی نصیر نے اوپر جا کر کہا کہ ”رئیس الاحرار آئے ہیں رائے پور جا رہے ہیں۔ صرف مصافحہ کرنا ہے۔“ میں نے کہا ”جلدی بلاؤ“ مرحوم اوپر چڑھے اور زینے پر چڑھتے ہی سلام کے بعد مصافحہ کے لئے ہاتھ

بڑھا کر کہا کہ ''رائے پور جارہا ہوں اور ایک سوال آپ سے کر کے جارہا ہوں اور پرسوں صبح واپسی ہے اس کا جواب آپ سوچ رکھیں، واپسی میں جواب لے لوں گا۔ یہ تصوف کیا بلا ہے؟ اس کی کیا حقیقت ہے؟'' میں نے مصافحہ کرتے کرتے یہ جواب دیا کہ ''صرف تصحیح نیت۔'' اس کے سوا کچھ نہیں۔ جس کی ابتداء اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ سے ہوتی ہے اور انتہا ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ'' ہے۔ میرے اس جواب پر سکتہ میں کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ''دلّی سے یہ سوچتا آرہا ہوں کہ تو یہ جواب دے گا تو یہ اعتراض کروں گا، اور یہ جواب دے گا تو یہ اعتراض، اس کو تو میں نے سوچا ہی نہیں۔'' میں نے کہا کہ جاؤ تانگے والے کو بھی تقاضا ہوگا، میرا بھی حرج ہو رہا ہے، پرسوں تک اس پر اعتراض سوچتے رہنا۔ اس کا خیال رہے کہ دن میں لمبی بات کا وقت نہیں ملنے کا، دو چار منٹ کو تو دن میں بھی کرلوں گا۔ لمبی بات چاہو گے تو مغرب کے بعد ہو سکے گی۔'' مرحوم دوسرے ہی دن شام کو مغرب کے قریب آگئے اور کہا کہ ''کل رات کو تو ٹھہرنا مشکل تھا اس لئے مجھے فلاں جلسہ میں جانا ہے اور رات کو تمہارے پاس ٹھہرنا ضروری ہو گیا، اس لئے ایک دن پہلے ہی چلا آیا۔'' اور یہ بھی کہا کہ ''تمہیں معلوم ہے مجھے تم سے کبھی نہ عقیدت ہوئی نہ محبت۔'' میں نے کہا ''علٰی ھٰذا القیاس.'' مرحوم نے کہا ''مگر تمہارے کل کے جواب نے مجھ پر تو بہت اثر کیا اور میں کل سے اب تک سوچتا رہا۔ تمہارے جواب پر کوئی اعتراض سمجھ میں نہیں آیا۔'' میں نے کہا ''انشاء اللہ مولانا اعتراض ملنے کا بھی نہیں۔''

''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ'' سارے تصوف کی ابتداء ہے اور ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ'' سارے تصوف کا منتہا ہے۔ اسی کو نسبت کہتے ہیں، اسی کو یادداشت کہتے ہیں، اسی کو حضوری کہتے ہیں۔

حضوری گر ہمی خواہی، از و غافل مشو حافظ
مَتٰی مَاتَلْقَ مَنْ تَھْوِیْ دَعِ الدُّنْیَا وَاَھْمِلْھَا

میں نے کہا ''مولوی صاحب سارے پاپڑ اسی کے لئے پیلے جاتے ہیں۔ ذکر بالجہر بھی اسی واسطے ہے، مُجاہدہ، مراقبہ بھی اسی واسطے ہے اور جس کو اللہ جل شانہٗ اپنے لطف وکرم سے کسی بھی طرح یہ دولت عطا کر دے اس کو کہیں کی بھی ضرورت نہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تو نبی کریم ﷺ کی نظر کیمیاء اثر سے ایک ہی نظر میں سب کچھ ہو جاتے تھے اور ان کو کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اس کے بعد اکابر اور حُکماء امت نے قلبی امراض کی کثرت کی بناء پر مختلف علاج جیسا کہ اَطبّاءِ بدنی امراض کے لئے

تجویز کرتے ہیں، روحانی اطباء نے روحانی امراض کے لئے ہر زمانے کے مناسب اپنے تجربات جو اسلاف کے تجربات سے مستنبط تھے نسخے تجویز فرمائے ہیں جو بعضوں کو بہت جلد نفع پہنچاتے ہیں، بعضوں کو بہت دیر لگتی ہے۔"

پھر میں نے مرحوم کو متعدد قصے سنائے، جن میں سے ایک قصہ تو میں نے اپنے والد صاحبؒ سے سنا اور کئی مرتبہ سنا، اور میں نے بھی حدیث کے اسباق میں اور دوستوں کی مجالس میں ہزاروں مرتبہ اس کو سنایا ہوگا وہ یہ کہ.....

قصبہ پانی پت کا ضلع کرنال ہے، ان دونوں کے درمیان جمنا چلتی تھی، معلوم نہیں اب بھی ایسا ہے یا نہیں، جمنا کا ہر جگہ دستور یہ ہے کہ خشکی کے زمانے میں لوگ جوتے ہاتھ میں لے کر پار ہو جاتے ہیں، جہاں پانی زیادہ ہو وہاں کشتیاں کھڑی رہتی ہیں، ملاح دو چار پیسے لے کر ادھر سے ادھر پہنچا دیتے ہیں، لیکن جب جمنا طغیانی پر ہو تو پھر عبور ناممکن ہوتا ہے۔

ایک شخص پانی پت کا رہنے والا، جس پر خون کا مقدمہ کرنال میں تھا اور جمنا میں طغیانی اور نہایت زور۔ وہ ایک ایک ملاح کی خوشامد درامد رہا، مگر ہر شخص کا ایک جواب کہ اس میں تیرے ساتھ اپنے آپ کو ڈبوئیں گے۔ وہ بیچارہ غریب پریشان روتا پھر رہا تھا۔ ایک شخص نے اس کی بدحالی دیکھ کر کہا کہ اگر میرا نام نہ لے تو ترکیب بتاؤں، جمنا کے قریب فلاں جگہ ایک جھونپڑی پڑی ہوئی ہے اس میں ایک صاحب مجذوب قسم کے پڑے رہتے ہیں، ان کے جا کر سر ہو جا، خوشامد، منت سماجت (خوشامد پر ایک قصہ کیمیا کا یاد آ گیا، وہ باب ہشتم میں یاد رہا تو انشاء اللہ لکھواؤں گا) جو کچھ تجھ سے ہو سکے کسر نہ چھوڑنا اور جتنا بھی برا بھلا کہیں حتیٰ کے اگر تجھے ماریں بھی تو منہ نہ موڑنا۔ چنانچہ یہ شخص ان کے پاس گیا اور ان سے خوشامد درآمد کی، انہوں نے اپنی عادت کے موافق خوب ملامت کی کہ میں کوئی خدا ہوں اس میں کیا کر سکتا ہوں؟ مگر جب یہ روتا ہی رہا (اور رونا تو بڑے کام کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب فرماوے) تو ان بزرگ نے کہا کہ "جمنا سے کہہ دے کہ اس شخص نے جس نے عمر بھر کچھ کھایا نہ بیوی کے پاس گیا، اس نے بھیجا ہے کہ مجھے راستہ دے دے۔" چنانچہ یہ گیا اور جمنا نے راستہ دے دیا۔ اس کا تو کام ہو گیا۔

اس میں کوئی اِستِبعَاد نہیں، پہلے انبیاء کے معجزات اس امت کی کرامات پانی پر چلنے کے قصے تو صحابہ کرام کے بھی تواریخ میں منقول ہیں، اور کراماتِ صحابہؓ تو مستقل ایک رسالہ حضرت تھانویؒ کے حکم سے لکھا گیا تھا، جس میں علاء بن الحضرمی صحابیؓ کی

ماتحتی میں ایک جہاد میں جو کسریٰ سے ہوا تھا۔ سمندر میں گھوڑے ڈال دینا اور سمندر کو پار کر دینا جس میں زینیں بھی نہ بھیگیں، نقلکیا گیا ہے۔ عاملِ کسریٰ یہ دیکھ کر ایک کشتی میں بیٹھ کر یہ کہہ کر بھاگ گیا کہ ان سے ہم نہیں لڑ سکتے۔ اس واقعے کو ابن عبدالبر اور تاج الدین سبکی نے بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔

اس جھونپڑی میں ان بزرگ کے بیوی بچے بھی تھے۔ دینداروں کی بیویاں ڈیڑھ خصم ہوتی ہیں، یہ بیچارے اس فکر میں رہتے ہیں کہیں زیادتی نہ ہو جائے۔ وہ اس سے غلط فائدہ اٹھا کر سر پر چڑھ جاتی ہیں، ان بزرگ کی بیوی نے رونا شروع کیا کہ ''عمر بھر کبھی کچھ کھایا نہیں، بغیر کھائے ہاتھی بن رہا ہے، اس کو تو تُو جانے تیرا خدا۔ مگر تُو نے جو یہ کہا کہ میں بیوی کے پاس کبھی نہیں گیا، یہ ستہ کی دھاڑ میں کہاں سے لائی؟'' انہوں نے ہر چند سمجھایا کہ ''یہ میری ہی اولاد ہے، میں نے ان کی اولاد ہونے سے انکار نہیں کیا۔'' مگر اس نے اتنا رونا چلانا شروع کیا کہ ''تُو نے میرا منہ کالا کر دیا، وہ ساری دنیا میں جا کر کہے گا کہ پیر صاحب تو بیوی کے پاس گئے نہیں، یہ اولاد کہاں سے آ گئی؟'' ہر چند پیر صاحب نے سمجھانا چاہا مگر اس کی عقل میں نہیں آیا، اور جتنا جتنا وہ کہتے وہ روتی۔ جب بہت دیر ہو گئی تو ان پیر صاحب نے یوں کہا کہ میں نے ساری عمر خوب کھایا اللہ کا شکر ہے اور تیرے سے صحبت بھی ہمیشہ خوب کی، تجھے بھی معلوم ہے لیکن بات یہ ہے کہ میں نے بچپن میں ایک مولانا سے وعظ میں بات سنی تھی۔ وہ یہ کہ جو کام اللہ کے واسطے کیا جائے وہ دنیا نہیں دین بن جاتا ہے اور عبادت بن جاتا ہے اور ثواب بن جاتا ہے، اس وقت سے میں نے جب بھی کوئی چیز کھائی یا تو اس نیت سے کھائی کہ اس سے اللہ کی عبادت پر قوت حاصل ہو یا اس نیت سے کھائی کہ لانے والے اور کھلانے والے کا دل خوش ہو۔ اسی طرح سے میں شادی کے بعد سے تیرے پاس خوب گیا، لیکن یہ قصہ پہلے سے سنا ہوا تھا اس لئے جب بھی میں تیرے پاس گیا تیرا حق ادا کرنے کی نیت پہلے سے کر لی کہ اللہ نے بیوی کا حق رکھا ہے۔

میں نے تو یہ قصہ اپنے والد صاحب سے بار بار ایسے ہی سنا۔ مگر مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں صاحب دام مجدہم نے حضرت الحاج شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی نقشبندی بھوپالی کے جو مفلوظات جمع کئے ہیں اس کے صفحہ ۳۵۶ پر یہ قصہ دوسری نوع سے نقل کیا ہے۔ جو حسبِ ذیل ہے:

حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ ایک بزرگ دریا کے کنارے پر تھے، دوسرے بزرگ دوسرے کنارے پر۔ ایک بزرگ نے جو متاہل اور صاحب اولاد تھے

اپنی بیوی سے کہا کہ ''کھانے کا ایک خوان لگا کر دریا کے دوسرے کنارے پر جو دوسرے بزرگ رہتے ہیں ان کے پاس لے جاؤ اور ان کو کھانا کھلا کر آؤ۔'' بیوی نے کہا کہ دریا گہرا ہے، میں اس کو کس طرح پار کر کے دوسرے کنارے جاؤں گی؟'' فرمایا کہ ''جب دریا میں قدم رکھنا تو میرا نام لے کر کہنا کہ اگر میرے اور میرے شوہر کے درمیان وہ تعلق ہو جو زن وشوہر میں ہوا کرتا ہے تو مجھے ڈبو دے ورنہ میں پار ہو جاؤں۔'' اس نے یہی کہا۔ یہ کہنا تھا کہ دریا پایاب ہو گیا اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں وہ دریا کے پار ہو گئیں۔ انہوں نے کھانے کا خوان ان دوسرے بزرگ کو پیش کیا انہوں نے اس کو اکیلے تناول فرمالیا (یعنی ختم کر دیا) جب واپس ہونے کا وقت ہوا تو ان کو فکر ہوئی کہ آنے کا وظیفہ تو مجھے معلوم ہو گیا، اب جاتے وقت کیا کہوں؟ ان بزرگ نے ان کی پریشانی دیکھی تو ان سے دریافت کیا، انہوں نے کہا کہ ''میں دریا کیسے پار کروں'' انہوں نے فرمایا کہ ''پہلی مرتبہ دریا کو کس طرح پار کیا تھا؟'' انہوں نے کہا کہ ''میرے شوہر نے مجھے یہ ہدایات کی تھی کہ میں اس طرح کہوں انہوں نے فرمایا کہ اب جائے تو میرا نام لے کر کہنا کہ ''اس نے ایک لقمہ بھی کھایا ہو تو بس ڈوب جاؤں ورنہ پار ہو جاؤں۔'' چنانچہ وہ پار ہو گئیں۔

اب انہوں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ آپ نے صاحبِ اولاد ہو کر خلاف واقعہ بات کیوں کہی؟ اور ان بزرگ نے آنکھوں کے سامنے پورا کھانا تناول کرنے کے باوجود ایک لقمہ بھی کھانے سے انکار کیوں کیا؟'' تو ان بزرگ نے جواب دیا کہ ''میں نے جو کچھ کیا امرِ الٰہی سے کیا اپنے نفس کی خواہش سے نہیں کیا، اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ امرِ الٰہی سے کیا نفس کا اس میں کچھ حصہ نہ تھا۔ اور دنیا جو کچھ کرتی ہے اور جس کا رواج ہے وہ نفس کے تقاضے کو پورا کرنا ہے امرِ الٰہی پیش نظر نہیں ہوتا، اس لئے دنیا جس کو ازدواجی تعلق اور شکم پری اور ناؤ نوش سمجھتی ہے، ہم دونوں میں سے کوئی اسکا مرتکب نہیں ہوا۔''

لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ واقعہ وہ پہلا ہو۔ اس قسم کے واقعات متعدد ہو سکتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے اس قسم کے واقعات پانی پر چلنا، دریا میں گھوڑوں کا اتار دینا مشہور ہیں۔

یہاں تک پہنچا تھا کہ عصر کے بعد کی مجلس میں شاہ علم اللہ صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے حالات سنائے جا رہے تھے۔ اس میں ایک قصہ کان میں پڑا تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ شاہ علم اللہ صاحب نے حضرت بایزید بسطامیؒ کا تذکرہ فرمایا کہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں ایک نہر حائل تھی، اس کے قریب پہنچتے ہی اچانک اس میں صاف راستہ بن گیا۔ حضرت خواجہ صاحب نے یہ دیکھ کر فرمایا ''هٰذَا مَكْرُ اللهِ هٰذَا مَكْرُ اللهِ''.

اس کے بعد انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ ”یہ نہر اسی حالت میں ہو جائے بندہ لوٹ جائے گا، یا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرلے گا لیکن تیری اس آزمائش سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔“

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ جب سلطان العارفین کو کرامات سے اس درجہ خوف اور گریز تھا، اور خدا کی شانِ بے نیازی سے وہ اس قدر ترساں ولرزاں رہتے تھے تو دوسرے کس شمار میں ہیں۔ طالبِ حق کو چاہیے کہ اللہ جل شانہٗ کے سامنے حضور در حضور کے سوا کسی اور چیز کے طلب گار نہ ہو ”کُلُّ مَا شَغَلَکَ عَنِ اللہ فَھُوَ صَنَمُکَ جو چیز تمہیں اللہ سے مشغول کردے وہی تمہارا بُت ہے۔ فقط

اس قصہ پر مجھے میرے حضرت، میرے محسن، میرے ماویٰ، میرے ملجا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کا ایک عجیب واقعہ یاد آیا۔ میرے جملہ اکابر کے یہاں تصرفات کی کوئی وقعت کبھی نہیں ہوئی، بلکہ ان کے روکنے کی کوشش ہوئی۔ میرے ایک مخلص دوست، جو عمر میں مجھ سے بہت بڑے مولوی حافظ عبدالرحمٰن صاحب گنگوہی میرے والد صاحبؒ کے بہت خاص شاگردوں میں تھے، اور یہ بہت بڑی پارٹی تھی بیس پچیس لڑکوں کی جو عربی پڑھتے تھے، فارسی اور قرآن پڑھنے والے تو سو سے زائد تھے، یہ گنگوہ میں والد صاحب سے پڑھا کرتے تھے۔ جب ۲۸ھ میں میرے والد صاحب قدس سرہٗ مستقل قیام کے ارادے سے مظاہر میں آگئے تو یہ سب خدام بھی آگئے اور علوم کی تکمیل ان سب کی مظاہر میں ہوئی، اور پھر علوم ظاہریہ کی تکمیل کے بعد یہ سب میرے حضرت مرشدی مہاجر مدنیؒ سے بیعت بھی ہوئے۔ ان میں سے مولوی عبدالرحمٰن صاحب شملہ کے قریب کسولی ایک جگہ ہے وہاں کے امام ہوگئے اور بڑے اونچے اونچے حالات خطوط میں لکھا کرتے تھے، اور چونکہ حضرت قدس سرہٗ کی ڈاک بھی میں ہی لکھتا تھا اس لئے دوستوں کے حالات بھی معلوم ہوتے رہتے تھے۔ مولوی عبدالرحمٰن مرحوم کا، اللہ تعالیٰ ان کو بہت بلند درجات عطا فرماوے، ایک بہت ہی طویل عجیب خط لکھا جس میں اپنے بہت سے مُکَاشَفَات، تَصَرُّفَات، خوارِق بہت ہی لمبے لکھے تھے، اور میں حضرت قدس سرہٗ کو خط سنا رہا تھا اور باغ باغ ہو رہا تھا کہ لونڈا چوتھے آسمان پر پہنچ گیا، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب خط کے جواب میں میرے حضرت قدس سرہٗ نے یہ لکھوایا کہ فرائض اور نوافلِ مسنونہ کے سوائے جملہ نوافل، جملہ اذکار واوراد ایک قلم موقوف رکھیں۔“ میں بالکل حیرت میں رہ گیا کہ یہ کیا ہوا؟

اور بھی متعدد قصے، ہمارے اکابر کے اس قسم کے پیش آئے۔ میرے چچا جان نور

اللہ مرقدہ قدس سرہٗ کے متعدد خطوط میں بھی جب خوارق اور تصرفات یا مکاشفات ہوتے تھے تو میرے حضرت بجائے حوصلہ افزائی کے اس قسم کے الفاظ لکھوایا کرتے تھے: ''ان چیزوں کی طرف التفات ہرگز نہ کریں کہ یہ ترقی سے مانع ہیں۔''

ہر نیکی صدقہ ہے بیوی سے صحبت بھی صدقہ ہے

میں نے مولانا رئیس الاحرار صاحب سے یہ بھی کہا کہ بچپن میں اس قسم کے قصے، کہانیوں کے ذیل میں سنے جاتے تھے، یا والد صاحبؒ اسباق میں سناتے تھے کہ میرے والد صاحبؒ کا اسباق میں قصے سنانے کا معمول ہوگیا تھا، جس کا ایک واقعہ ان حالات میں فتح القدیر کے سلسلے میں بھی آوے گا لیکن جب مشکوٰۃ شریف پڑھانے کی نوبت آئی تو یہ مضمون حدیث پاک میں تشریح سے ملا۔ حضور ﷺ کا پاک ارشاد ہے جو مشکوٰۃ شریف کے باب صلوٰۃ الضحیٰ میں منقول ہے کہ آدمی میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، جب آدمی صبح کو صحیح وسالم تندرست اٹھتا ہے تو ہر جوڑ کی صحت وسلامتی کے بدلے اس کے ذمہ ایک صدقہ (شکرانہ) واجب ہوتا ہے ایک دفعہ ''سُبْحَانَ اللّٰہ'' کہنا ایک صدقہ ہے، ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ'' کہنا صدقہ ہے، ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ'' کہنا صدقہ ہے، اَللّٰہُ اَکْبَر کہنا صدقہ ہے، امر بالمعروف صدقہ ہے، راستہ میں سے کوئی تکلیف دہ چیز کانٹا وغیرہ ہٹا دینا صدقہ ہے، آدمی اپنی بیوی سے صحبت کرے یہ بھی صدقہ ہے، اور دو رکعت چاشت کی نماز ان سارے ۳۶۰ صدقوں کا قائم مقام ہے (اس لئے کہ نماز میں ہر جوڑ سے کام پڑتا ہے، اس لئے نماز کی دو رکعت سب کے قائم مقام ہو جاتی ہے) صحابہ کرامؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آدمی اپنی بیوی سے شہوت پوری کرتا ہے، اس میں بھی صدقہ ہے؟ صحابۂ کرامؓ کو اللہ جل شانہٗ بہت ہی درجاتِ عالیہ اپنی اور ان کی شایانِ شان عطا فرماوے، حضور ﷺ سے ذرا ذرا سی بات پر دریافت کر کے امت کے لئے بہت کچھ ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ حضور ﷺ نے صحابہؓ کے استعجال پر یوں فرمایا کہ اگر اس پانی کو بے محل رکھے یعنی حرام کاری کرے تو کیا گناہ نہیں ہوگا؟ صحابہؓ نے عرض کیا، ضرور ہوگا، تو حضور ﷺ نے فرمایا پھر یعنی اگر حرام سے بچنے کی نیت سے اپنی بیوی سے صحبت کرے تو کیوں ثواب نہ ہو۔''

اس کی تائید بہت سے روایات اور مضامین سے بھی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کا لطف و احسان اور اس کے پاک رسول ﷺ کی برکتیں تو لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی ہیں مگر ہم لوگ اپنی ناقدری سے ان قیمتی جواہرات اور موتیوں کو پاؤں سے روندتے ہیں۔ ان کی طرف التفات نہ کریں

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اخلاص سے آگ لینے جانے میں بھی پیمبری مل جاتی ہے۔ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک مشہور مقولہ جو سینکڑوں دفعہ سنا ہوگا کہ ''اتباع سنت کے ساتھ اتباع کی نیت سے پائخانہ میں جانا خلافِ سنت نفلیں پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔'' یہی وہ چیز ہے جس سے میں نے اس مضمون کی ابتداء کی تھی۔

تنبیہ

آخر میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا تعلق اور تربیت صاحبزادگان کی درخواست

مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کے متعلق میں نے جو اپنی ابتدائی لڑائی لکھی اور بہت سخت تھی، بڑی ناشکری ہوگی اگر اس کا تکملہ اور منتہا نہ لکھوں آخر میں تو مرحوم کو حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی برکت سے اتنی محبت ہوگئی تھی جس کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ مولانا مرحوم مستقل میرے پاس قیام پر اصرار فرماتے رہے۔ مولانا نے ازراہِ محبت یہ بھی اصرار کیا کہ وہ اپنے چھوٹے لڑکوں کو میری تربیت میں رکھیں، میں نے باوجود ان کی شفقت ومحبت واصرار کے معذرت کردی۔ انہوں نے حضرت اقدس سیدی ومولائی شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے اصرار بہت زور سے کرایا تو میں نے حضرت سے کہا کہ یہ رئیس الاحرار کے صاحبزادے ہیں، میرا ان کا جوڑ نہیں کھانے کا۔ مولانا مرحوم نے کہا کہ تیری ساری شرائط منظور ہوں گی، اور حضرتؒ اس کے ضامن ہوں گے، تو قرعۂ فال عزیز گرامی قدر ومنزلت مولوی رئیس الرحمٰن ناظم مدرسہ والی مسجد خالصہ کالج لائلپور کے نام نکلا کہ ان کی تعلیم اس وقت ایسی تھی کہ میرے پاس جوڑ کھا سکتی تھی، میں نے چار شرائط لگائیں۔

(۱) اخبار دیکھنے کی بالکل اجازت نہیں ہوگی۔ اگر کوئی شکایت کسی وقت اخبار دیکھنے کی مجھ تک پہنچی تو سلام علیک۔

(۲) کسی جلسے میں جانے کی اجازت نہ ہوگی، چاہے ابا جان کی تقریر ہو چاہے شاہ بخاری کی، چاہے حضرت مدنی قدس سرہٗ کی، چاہے اس تقریر میں میں خود بھی شریک ہوں۔

چاہے میں کسی لحاظ ملاحظہ سے اجازت بھی دے دوں۔

مولانا مرحوم نے ان دونوں شرائط کو بہت ہی بشاشت سے قبول فرمایا اور فرمایا کہ میری اور شاہ جی کی تقریر میں جانے کی ہرگز اجازت نہیں، سیاست ہمارے گھر کی لونڈیاں ہے، ہم اس سے نمٹنے کے بعد سیاست دو مہینے میں سکھلا دیں گے۔

(۳) تیسری شرط یہ رکھی کہ مدرسہ سے بغیر اجازت باہر نکلنا نہ ہوگا۔

(۴) چوتھی شرط یہ کہ طلبا سے تعلقات نہ رکھنے ہوں گے نہ دوستی کے، نہ دشمنی کے، نہ محبت کے، نہ مخالفت کے۔

عزیز موصوف کو اللہ بہت ہی جزائے خیر دے، میں ہمیشہ اس کی اس ادا کا ممنون رہوں گا کہ پہلی دو شرطوں پر تو اس نے میری امید سے بہت زیادہ عمل کر کے دکھلا دیا، حتی کہ ایک دو سال بعد جب میں نے مَضَرَّت نہ سمجھ کر اکابرِ ثلاثہ مذکور کی تقریر میں جانے کی اجازت بھی دی اور دل سے دی، اخلاص سے دی تب بھی عزیز موصوف نے کہہ دیا کہ اب تو وعدہ پورا کرنا ہی ہے۔

اسی کا وہ ثمرہ تھا کہ حضرت اقدس سیدی و مولائی حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی نگاہ میں بھی عزیز موصوف منظور نگاہ بن گیا اور حضرت اقدس سرہٗ کی طرف سے خلافت بیعت عطا ہوئی۔ اللہ جل شانہٗ اپنے فضل و کرم سے عزیز موصوف کو نیز عبدالجلیل کو بھی دونوں ایک ہی سال کے مظاہر کے فارغ التحصیل ہیں، یعنی ۶۰ھ کے اور دونوں کو ہی حضرت قدس سرہٗ کی طرف سے خلافت عطا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ دونوں سے اپنی مخلوق کی ہدایت کا کام لے۔

البتہ تیسری چوتھی شرط پر وہ پختگی نہ دکھا سکا جو پہلی دو شرطوں پر دکھلائی اگر میں یہ کہوں کہ اس میں میری ہی کمزوری کو دخل تھا تو بے محل نہ ہوگا۔

مولوی انیس الرحمٰن و مولوی عبدالجلیل صاحبان کا ذکرِ جمیل

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے اصرار میں کچھ عزیز عبدالجلیل کو بھی دخل تھا جو حضرت قدس سرہٗ کا بھتیجا میرے ہی پاس رہتا تھا، مدرسہ میں پڑھتا تھا، بہت ہی یکسو قابل رشک زندگی گزارتا تھا، اس کی ایک ادا اس وقت کی مجھے بہت ہی پسند تھی کہ جب حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کی آمد پر حضرت کا قیام یا دعوت کسی جگہ ہوتی تو یہ کبھی کھانا کھائے بغیر حضرتؒ کی مجلس میں نہیں جاتا تھا، میرے یہاں سے کھانے سے نمٹ کر جاتا تھا۔ اور لوگوں کے اصرار پر بھی شدت سے انکار کر دیتا تھا کہ ''میں کھا کر آیا ہوں۔'' حضرتؒ بھی فرماتے

اور میں تقاضے کرتا مگر یہ ہمیشہ ہی عذر کرتا کہ میں کھا کر آیا۔ اور عذر جھوٹا نہیں ہوتا تھا قبل از وقت بھی گھر سے کھانا لے کر وہ کھا کر جاتا، بلکہ بعض دفعہ تو پہلے سے دعوت کرنے والوں کو بھی یہ کہہ کر عذر کر دیتا تھا کہ اس وقت آنے میں سبق کا حرج ہوگا یا مطالعہ کا حرج ہوگا۔

باب دوم

درس وتدریس اور مظاہر علوم وتالیفات

اس ناکارہ کی پیدائش ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۱۵ھ کی شب میں رات کو ۱۱ بجے تراویح کے بعد ہوئی، جیسا کہ معروف ہے اس سیہ کار کا نسب نامہ مع اپنی ساری شاخوں کے اور سارے شجرۂ خاندان کے میری تاریخ کبیر میں بہت مفصل مشرح موجود ہے، مگر تیس برس سے پہلے پہلے کے تو سارے بچے کچے اس میں موجود ہوں گے، اس کے بعد کچھ مشاغل اور کچھ آنکھوں کی مجبوری سے اب بیس پچیس سال سے اس کا سلسلہ چھوٹ گیا ورنہ وہ بہت مفصل ہے کوئی دیکھنا چاہے تو شوق سے دیکھ لے، نیز اس کا کچھ حصہ حالت مشائخ کاندھلہ میں مولوی احتشام صاحب بھی شائع کر چکے ہیں۔

ڈھائی برس کی عمر تک یہ ناکارہ کاندھلہ رہا۔ سنا ہے کہ اس قدر نالائق تھا کہ میرا کھیل توڑ پھوڑ تھا، میری نانی میرے لئے بہت سے برتن ڈول چھوٹی موٹی مٹی کی پیالیاں جو اس زمانے میں بہت کثرت سے کمہاریاں بنایا کرتی تھیں اور گھروں میں بچوں کو کھیلنے کے واسطے قیمتاً دے جایا کرتی تھیں، جس مکان میں اس ناکارہ کی پیدائش ہوئی تھی اس میں ایک چبوترہ بہت اونچا تھا جو اب تک خوب یاد ہے، یہ ناکارہ اس چبوترے کے اوپر بیٹھ کر ان پیالیوں اور ڈول وغیرہ کو زور سے نیچے پھینکتا، اور جب وہ ٹوٹ جاتیں تو خوب خوش ہوتا اور جب نہ ٹوٹتیں تو بچوں کی طرح نیچے اتر کر بڑی مشقت سے اس کو اوپر لے جا کر پھر نیچے پھینکتا۔ سنا ہے کہ میری والدہ نور اللہ مرقدہا میری اس ناپاک حرکت پر مجھے ڈانٹا کرتیں تو میری نانی مرحومہ میری والدہ پر خفا ہوتیں کہ میری زندگی میں اگر تو نے میرے بچے کو کچھ کہا تو تیری خیر نہیں جب اس کا دل برتن پھوڑ کر خوش ہوتا ہے تو مجھے تو اس کی خوشی چاہیے۔

ڈھائی برس کی عمر میں گنگوہ حاضری ہوئی تو وہاں حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کے سب خدام کے یہاں والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی وجہ سے لاڈ ہی لاڈ اور پیار تھا۔ یہ منظر تو مجھے اب تک یاد ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے بڑے بھائی حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ اَعْلَی اللہُ مَرَاتِبَہ اس سیہ کار کو اپنی گردن پر دن

بجر بٹھائے رکھتے ایک ٹانگ سینے کے ایک طرف دوسری ٹانگ دوسری طرف لٹکائے ہوئے میں گردن پر سوار رہتا، وہ اسی حالت میں اپنے کام میں مشغول رہتے، بازار جاتے یا کسی کام کو جاتے تب بھی میں ان کی گردن پر سوار رہتا، نماز کے وقت البتہ اتار دیتے تھے ۔حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ ۲۰ھ میں گنگوہ حاضر ہوئے تھے اور اوائل ۲۴ھ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد مدینہ منورہ واپس چلے گئے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی خودنوشت سوانح نقش حیات کے صفحہ ۶۵ پر اسی طرح موجود ہے، مگر میری تاریخ کبیر میں ۲۶ھ میں ان کا ہندوستان ہونا مذکور ہے۔

ہمارے خاندان میں عموماً چوتھے یا پانچویں برس بچہ پڑھنے بیٹھ جاتا تھا مگر میں سات برس کی عمر یا اس سے زائد پر بھی پڑھنے نہیں بیٹھا۔ میری دادی صاحبہؒ میرے والد صاحب پر خوب خفا ہوتیں، مجھے ان کی خفگی کے الفاظ بھی خوب یاد ہیں کہ ''یحییٰ! اولاد کی محبت سب کو ہوا کرے مگر اولاد کی محبت میں اندھے نہیں ہو جایا کرتے۔''

میرے والد صاحب دودھ پینے کے زمانے میں پاؤ پارہ یاد کر چکے تھے اور سات برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر چکے تھے اور اس کے ساتھ میرے دادا سے مخفی اپنے چچا جانؒ سے فارسی سکندر نامہ، زلیخا، بوستان وغیرہ سب کو پڑھ چکے تھے۔ اور میرے دادا صاحب نے ان کو سات برس کی عمر میں یوں کہہ دیا تھا کہ ''ایک قرآن روز پڑھ لیا کرو باقی سارے دن چھٹی، چھ ماہ کے بعد عربی شروع کروائیں گے۔'' میرے والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز پڑھتے ہی اپنی چھت پر بیٹھتا، وہ اپنی نانی صاحبہ کے مکان کی چھت بھی دکھلایا کرتے، اور ظہر سے پہلے قرآن شریف ختم کر کے پھرا تر کر روٹی کھایا کرتے تھے، اور شام کو اپنے شوق سے ابتدائی عربی شروع کر دی تھی۔ اس لئے میری دادی صاحبہ کو اور بھی زیادہ غصہ آتا وہ فرماتیں کہ ''یہ بیل آسمان پر جا رہا ہے تو آخر اس سے کیا کرائے گا؟ جوتے گٹھوائے گا، چمار بناوے گا، پاخانہ کمواوے گا، بھنگی بناوے گا، آخر تو نے کیا سوچ رکھا ہے؟'' ان کی شدید خفگی مجھے خوب یاد ہے، اور میرے والد صاحبؒ کا ایک جواب کہ ''آپا جو دن کھیلنے کو ملیں کھیلنے دو، ایک دفعہ جب اوکھل میں سر دے گا تو پھر قبر میں جاتے ہوئے نکلے گا۔'' اس جواب پر بہت ناراض ہوتیں کہ ''آخر اوکھل میں سر دینے کا کوئی وقت آوے گا یا مرنے کے بعد دے گا؟'' مجھ پر براہِ راست بھی خفا ہوتیں کہ ''فلاں بچے کے اتنے سپارے ہو گئے فلاں کے اتنے ہو گئے، تیرے کتنے ہوئے اندھے؟''

ساتواں یا آٹھواں سال تھا۔ گنگوہ میں جناب الحاج ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مظفر نگری جو

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے وہ اور ان کے اہلیہ عاشق زار۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے لئے بڑے اہتمام سے پلاؤ پکایا کرتے تھے، مجھے بھی خوب یاد ہے، ان کا پکانا بھی اور حضرت اقدس گنگوہی قدس سرہٗ کے ساتھ کھانا بھی معلوم نہیں روزانہ ایک مرغ تو ضرور کٹتا تھا اور اس میں نہ معلوم کتنی چیزیں پڑی تھیں، مرغے بھی ڈاکٹر صاحب نے بہت پال رکھے تھے ،اور ان کو بھی نہ معلوم کیا کیا کھلایا جاتا تھا۔

انہی ڈاکٹر صاحب کے متعلق تذکرۃ الرشید میں ایک قصہ یاد پڑتا ہے بچپن کا پڑھا ہوا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! یہ ڈاکٹر صاحب یہاں کیا کرتے ہیں ؟ مطلب یہ تھا کہ ذکر شغل سلوکی مشاغل جس میں خانقاہ کے سارے خدام ہر وقت مشغول رہتے تھے، ڈاکٹر صاحب ان میں زیادہ مشغول نہ رہتے تھے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے بے ساختہ فرمایا کہ ''مجھے پلاؤ کھلانے کے لئے۔''

ان کی اہلیہ محترمہ سے ہمارا قاعدہ بغدادی شروع ہوا۔ پڑھنے پڑھانے کا تو ہمیں کچھ یاد نہیں، دو باتیں ضرور یاد ہیں، ابا جان کی یہاں کتابوں کی دکان تھی، قاعدہ بغدادی کی گڈی ہمیں معلوم تھی، تین چار دن میں پہلا پھاڑ کر دوسرا لے آیا کرتے تھے، دوسری بات یہ خوب یاد ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کی اہلیہ مرحومہ، اگر یہ ناکارہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوتا تھا تو اس پلاؤ میں سے میرا حصہ ضرور نکالتے تھے۔ اس کے علاوہ بادام اور کشمش اور کھویا، یہ تین چیزیں بھی خوب یاد ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دن بھر کھانے میں گزرتا تھا، یاد نہیں قاعدہ بغدادی کتنے دنوں میں پڑھا یا نہیں پڑھا، اس کے بعد ہمارا سیپارہ لگ گیا۔

کسی مکتب میں یا کسی باقاعدہ حافظ صاحب کے پاس تو پڑھنے کی نوبت کبھی آئی نہیں، اس واسطے کہ آپ بیتی نمبر ۱ میں یہ مضمون گزر چکا ہے کہ میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے یہاں پڑھنے سے زیادہ اہم اختلاط سے حفاظت تھی۔ اسی واسطے قرآن پاک اب تک بھی فارسی میں پڑھ رہا ہوں۔

میرے ابا جان کے خاص شاگردوں میں ایک صاحب حافظ ابراہیم صاحب رسولپوری بھی تھے جو گنگوہ میں ابا جان کے پاس پڑھا کرتے تھے، قرآن اچھا پڑھتے تھے حافظ تھے، ایک دن کے واسطے ہماری شاگردی ان حافظ صاحب کے حوالہ ہوئی اور سر منڈواتے ہی اولے پڑ گئے۔ ہوا یہ کہ اس دن میری اپنی والدہ صاحبہ سے لڑائی ہوگئی، ایک پیسہ کہیں سے آ گیا تھا، اس میں ایک طرف تو سکہ تھا دوسری طرف تلوار کا نشان تھا، مجھے بہت

اچھا لگتا تھا، میں نے والدہ مرحومہ نوراللہ مرقدہا کے پاس امانت رکھوایا تھا، ان کو کچھ اہمیت نہ ہوئی، انہوں نے خرچ کر ڈالا، ایک دن پہلے اس سیاہ کار نے ان سے مانگا، انہوں نے فرمایا کہ وہ خرچ ہوگیا، کہیں سے آوے گا تو دے دوں گی، اس زمانے میں اس قسم کے اکثر سکے آتے رہتے تھے، اپنے غصہ سے تو یہ سیہ کار اب تک بھی عاجز ہے۔ غصہ میں رات کو روٹی نہ کھائی، صبح کو والدہ صاحبہ نے جدید استاد حافظ صاحب مرحوم سے کہلوا دیا کہ اس نے رات غصہ میں روٹی نہیں کھائی۔ حافظ صاحب مرحوم نے فرمایا کہ جا روٹی کھا کر آ، میں نے کہا کہ ''جی میرا پیسہ مل جاوے گا تو کھالوں گا۔'' انہوں نے فرمایا، ''اچھا تو کان پکڑ لے اور جب روٹی کھاوے گا چھوڑ دیجئے۔'' پکڑ لئے، جب حافظ صاحب سبق کے لئے گئے جو آدھ پون گھنٹے کا تھا اس وقت چھوڑ دیئے، جب دور سے آتے دیکھا تب پکڑ لئے، دو ایک گھنٹہ کے بعد پھر وہ ابا جان کے پاس سبق کیلئے گئے پھر چھوڑ دیئے، پھر وہ ظہر کی نماز کے لئے تشریف لے گئے پھر چھوڑ دیئے، عصر کی نماز تک یہی قصہ رہا۔ رات بھی روٹی نہ کھائی تھی اس واسطے ماں پر جو گزرنی چاہیے تھے گزری۔ دوپہر کو والدہ کو معلوم ہوا کہ حافظ جی نے چھٹی بند کر رکھی ہے جب تک روٹی نہ کھاوے گا چھٹی نہیں ملے گی، اور میری ایک درخواست تھی کہ ''تلوار کا پیسہ مل جاوے تو کھالوں گا۔''

عصر کے بعد جب ابا جان کو یہ قصہ معلوم ہوا تو ہماری یہ ایک روزہ شاگردی ختم ہوگئی۔ ابا جان نے حافظ صاحب کو فرمایا کہ ''حافظ جی تربیت کے لئے تو میں خود کافی ہوں، آپ کے سپرد تو اس وجہ سے کیا تھا کہ آپ کے سامنے بیٹھ کر یہ یاد کرتا رہے گا۔''

ہماری شاگردی تو اس وقت سے ختم ہوگئی، مگر یہ حافظ صاحبؒ اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطا فرماوے، بعد میں بہت اصرار سے اس سیہ کار سے بیعت بھی ہوگئے۔ جب وہ میرے جوتے کو ہاتھ لگاتے تو میں ان سے کہتا ''ایسا ہرگز نہ کیجئے آپ میرے استاد ہیں۔'' وہ مرحوم بہت ہی شرمندہ ہوتے۔ ایک مرتبہ میں نے ان کو اس حرکت سے روکنے کے لئے جواباً ان کے جوتے کو سیدھا کر کے رکھ دیا، اس پر وہ بیچارے بہت ہی پشیمان ہوئے۔ میں نے کہا کہ ''جب آپ میرے جوتے کو ہاتھ لگاویں گے اس کا ردعمل میں یہی کروں گا۔''

حافظ صاحب کی ولادت تقریباً ۱۳۰۲ھ میں ہے اور وصال ۵ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۳ اگست، ۱۹۳۷ء شب جمعہ۔ حافظ صاحب نے رائپور کے مدرسہ میں قرآن پاک حفظ کیا اور وہیں اردو وغیرہ پڑھی۔

اس کے علاوہ ایک عرصہ کے بعد عالی جناب حافظ محمد صالح صاحب نکور در ضلع جالندھر کے اصل رہنے والے تھے، جو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے ،نہایت بزرگ ،نہایت نیک ،نہایت متواضع ،نہایت خاشع خاضع ، بڑی کثرت سے نفلیں پڑھنے والے، وہ جب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو تبرکاً میرے والد صاحب نے مجھے ان کی شاگردی میں بھی حصولِ برکت کے لئے چند روز رکھا، جب تک حافظ صاحبؒ کا گنگوہ میں قیام رہا۔

اس کے علاوہ جب بھی کاندھلہ جانا ہوتا تو ہمارے کاندھلہ کے مشہور معروف حافظ ، استاذ الکل حافظ رحیم بخش صاحب ابن حافظ خدا بخش عرف ''حافظ منکتو'' میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور ان کے معاصرین اور ان سے چھوٹی پیڑھی میرے بعد تک کی ساری ہی حافظ صاحبؒ کے شاگرد ہیں۔ وہ قوم کے نیل گر تھے اور نیل کا کام ان کے گھر میں ہوتا تھا۔ مرحوم چھٹی لینا بیماری یا کسی اور حرج میں جانتے ہی نہ تھے ایک دفعہ بہت شدید بیماری میں چند روز کے لئے جب اٹھنے کے قابل نہ تھے، گھر پر رہے تو ہم شاگردوں کو مکان ہی میں بلا لیا تھا، وہیں پڑے پڑے پڑھاتے تھے۔ بہت ہی بزرگ اور نیک تھے۔ چائے وغیرہ تو اس زمانے میں کاندھلہ میں دوا کے لئے تلاش سے بھی نہ ملتی تھی اس لئے یہ مدتو تھا ہی نہیں ، اپنے محلّہ کی مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے کے بعد اور وظائف پڑھتے ہوئے کاندھلہ کے مشہور مدرسہ قرآنیہ میں تشریف لاتے جو جامع مسجد کے بالکل مقابل تھا، آتے ہی پہلے جامع مسجد میں تشریف لے جاتے ، اشراق کی نماز پڑھتے ، نماز پڑھ کر مکتب میں آتے اور متسابقین جس میں یہ ناکارہ بھی کبھی ہوتا جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور حافظ صاحب کے سلام پھیرتے ہی جہاں انہوں نے جوتے پہنے دو تین ایک دم سبق سنانا شروع کر دیتے تھے۔ مرحوم جو پہلے بسم اللہ کر دیتا اس کا شروع کر دیتے باقی کہ کہہ دیتے کہ ''چشت'' جو ہمارے یہاں ڈانٹ کا ایک فقرہ ہے۔ اس مکتب میں ایک انار کا چھوٹا سا درخت تھا۔ گرمی سردی ہر موسم میں جب اس انار کے درخت کی جڑ میں دھوپ آجاتی تو حافظ صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے ، نہایت اطمینان سے جامع مسجد تشریف لے جاتے ، تجدید وضو فرماتے ، چاشت کی نماز بہت اطمینان سے پڑھتے اور ان کے اٹھتے ہی سارے مکتب کے بچے اپنے اپنے قرآن جزدان میں بند کر دیتے مگر کیا مجال تھی کہ کوئی لڑکا پہلے جا سکے، حالانکہ اگر دو چار بھی چلے جاتے تو کیا پتہ چلتا۔ مگر ایک بچے کی بھی ہمت نہ ہوتی ، چاہے کتنا چھوٹا ہو کہ حافظ صاحب سے پہلے جا سکے۔ چاشت کی نماز پڑھ کر حافظ صاحب مکتب میں آتے اور

جوتا نکالنے سے پہلے ہی کسی لڑکے سے کہتے کہ ''لا میری لنگی اٹھا دے۔'' یہ اعلان چھٹی کا تھا ۔حافظ صاحبؒ کا یہ ارشاد فرمانا اور لڑکوں میں ایک دم بھگدڑ مچنا، آخیر میں حافظ صاحب ہی تنہا مدرسہ سے نکلا کرتے ۔حضرت حافظ صاحبؒ مارتے کم تھے، مگر ان کا رعب اس قدر سخت تھا کہ اب تک بھی اس کے تصور سے خوف سا آجاتا ہے ۔ دوسرے مدرس دوم حافظ عبدالسبحان مرحوم تھے ۔وہ اتنا سخت مارتے تھے کہ ان کے درجہ میں ہر وقت کہرام مچا رہتا۔ حافظ صاحبؒ کی پہلی تنبیہ یہ ہوا کرتی ''یاد نہیں کرتا سبحان کے پاس بھیج دوں گا۔''

یہ ناکارہ جب کاندھلہ دو چار دن کو جاتا حافظ صاحبؒ کی شاگردی میں داخل ہو جاتا، شاید دو ڈھائی سپارے پوری مقدار مختلف سالوں کی ہوگی ۔حافظ صاحب کو میرے دادا نور اللہ مرقدہٗ نے اس مدرسہ میں دو روپے پر مدرس رکھا تھا، پندرہ بیس برس بعد معہ ے ہو گئے تھے ۔ ہمارے کاندھلہ کے اکابر جب علی گڑھ سے وابستہ ہوئے تو انہوں نے بہت ہی کوشش کی کہ حافظ صاحب کو کالج میں قرآن کا مدرس بنا کر س ۴۰، ص ۵۰، ۶۰ ماہ ۱۰۰ تک لے جایا جاوے ۔حافظ صاحبؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ایسے کا بٹھایا ہوا ہوں کہ معمار تار پر بھی نہیں جا سکتا۔

سنا گیا ہے کہ حافظ صاحب مرحوم پہلے پہلوانی کرتے تھے اور کسی پہلوان کے پچھاڑنے کے لئے میرے دادا کے پاس تعویذ لینے گئے ۔ان کو پسند آ گئے، انہوں نے حال دریافت کیا۔ ''کون ہو؟ کہاں رہتے ہو؟'' نیل گر ہوں!، پہلوانی کرتا ہوں ۔ مولانا نے فرمایا، ''کچھ اور بھی آتا ہے؟'' انہوں نے کہا قرآن حفظ کیا ہے ۔ دادا نے قرآن سنا اور اس کے بعد پہلوانی سے توبہ کرائی، بیعت کیا اور فرمایا کہ عار ۲ مہینہ میں دے دوں گا تم بچوں کو قرآن پڑھایا کرو، اور نیل گروں کی مسجد میں ان کو بٹھا کر محلّہ کے بچوں کو سپرد کر دیا۔ دادا صاحب کے جانے کے بعد شرفائے قصبہ نے اس میں اپنی توہین سمجھی کہ ان کے بچے نیل گر سے پڑھیں، انہوں نے اپنے بچوں کو اٹھا لیا، چند ماہ بعد جب دادا صاحب دوبارہ آئے اور حال معلوم کیا تو بہت ناراض ہوئے اور ان کے لئے جامع مسجد کے سامنے منہدمہ مسجد میں مدرسہ بنا دیا۔

میرے دادا صاحب کے انتقال کے بعد میرے تایا صاحب مولانا محمد صاحب سے بھی نیاز مندانہ تعلق رہا۔ اور میرے چچا تو ان کے شاگرد تھے، میں نے بارہا دیکھا کہ چچا جان جب کاندھلہ جاتے تو حافظ صاحب کی بہت ادب سے اہتمام سے دست بوسی کرتے۔ حافظ صاحبؒ نے حضرت مولانا حکیم صدیق احمد صاحب کاندھلوی یکے از خلفاء قطب عالم

گنگوہیؒ سے قرآن شریف کا لفظی ترجمہ حرفاً حرفاً پڑھا۔

مشہور ہے کہ حافظ صاحب کی چالیس سال تک تکبیرِ تحریمہ ایک دفعہ کے علاوہ فوت نہیں ہوئی۔ ۱۳۴۷ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ان کے حافظ کردہ ۴۰۰ کے قریب ہیں۔ اور کیرانہ کے راستے میں اپنی باغیچی میں مدفون ہیں۔ (کذا فی مکتوب الحاج صوفی افتخار الحسن کاندھلوی) حضرت حافظ صاحب کو فارسی بہت اچھی آتی تھی۔ اپنے صاحبزادوں کو خود فارسی پڑھایا کرتے تھے۔

ان دو بزرگوں کے علاوہ کسی سے قرآن پاک پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ نقل نظامی قرآن جس میں میں نے پڑھا، اور اس کا ہر صفحہ آیت پر ختم ہوتا ہے ایک صفحہ کے متعلق میرے والد صاحب کا حکم یہ تھا کہ ''اس کو ۱۰۰ دفعہ پڑھ دو پھر چھوڑ دو، یاد ہونے کے ذمہ دار نہیں۔'' کبھی سو ۱۰۰ دفعہ پڑھا ہو تو یہ بھی اندازہ ہو کہ کتنی دیر میں سو دفعہ ہوتا ہے۔ اپنی ایک حماقت ساری عمر یاد رہے گی کہ دس پندرہ منٹ میں آکر کہہ دیتا کہ سو دفعہ ہو گیا اور اپنے کلام کو موثق اور مؤکد بنانے کے واسطے یا اپنی حماقت کے اظہار کے واسطے خود ہی کہہ دیتا کہ آج بالکل صحیح صحیح ہوا کل تو کچھ گڑبڑ بھی تھی اور ابا جان کا یہ مقولہ بھی ہمیشہ یاد رہے گا کہ ''آج کا بالکل صحیح صحیح کل تو معلوم ہو جاوے گا سمجھ تو اب تک بھی نصیب نہ ہوئی اس وقت تو عمر بھی سمجھ کی نہ تھی کبھی ابا جان کے اس ارشاد کا مطلب ہی سمجھ میں نہ آیا کہ آج کا بالکل صحیح صحیح کل کو معلوم ہو جاوے گا۔ سارا قرآن پاک اسی طرح پڑھ کر ختم کر دیا اور حافظ ہو گئے۔

میری دادی صاحبہ نور اللہ مرقدہٗ حافظہ تھیں اور بہت اچھا یاد تھا۔ سال بھر کا معمول خانگی مشاغل، کھانے پکانے کے علاوہ ایک منزل روزانہ کا تھا۔ اور رمضان میں چالیس پارے روزانہ کا تھا۔ ان کے کچھ حالات تذکرۃ الخلیل میں بھی ہیں۔ جب وہ گنگوہی میں ہوتیں تو میرا سبق ان کے ذمہ تھا، وہ نہ ہوتیں تو والد صاحب کبھی اپنی سامنے کسی بچے کو بٹھا کر سنو دیتے۔ جن میں میرے مخلص دوست مولوی عبدالرحمٰن صاحب، گنگوہی جن کا ذکر اس میں پہلے گزر چکا ہے یا میرے والد صاحبؒ کے محبوب شاگرد مولوی سعید مرحوم گنگوہی ہوا کرتے تھے اور گویا قرآن شریف ختم ہوا جانے کے بعد مولوی سعید مرحوم کے ذمہ میرا سپارہ سننا بھی تھا۔ اس میں ایک پارہ میں سو ۱۰۰ غلطیاں معاف تھیں اور والد نور اللہ مرقدہٗ بھی کبھی سفر میں سنا کرتے تھے مگر اس میں تو جو یاد تھا وہ بھی بھول جاتا تھا۔

رمضان المبارک میں قرآن کا ابتدائی معمول

قرآن شریف کی یاد تو کما حقہ، اب تک بھی نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن ۱۳۸ھ سے

ماہ مبارک میں ایک قرآن روزانہ پڑھنے کا معمول شروع میں ہوا تھا جو تقریباً ۸۰ھ تک رہا ہوگا، بلکہ اس کے بھی بعد تک۔ ابتدائی معمول یہ تھا کہ سوا پارہ جس کو عموماً حکیم اسحاق صاحب کی مسجد میں سنانے کی نوبت آتی تھی یا میرے حضرت نوراللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ کے گھر میں، اس کو تراویح کے بعد شب میں قرآن پاک دیکھ کر اور اکثر ترجمہ کے ساتھ سحر تک چار (۴) پانچ (۵) دفعہ پڑھتا تھا، گرمیوں کی شب میں کچھ کم، سردیوں میں کچھ زائد۔ اس کے بعد تہجد میں اس کو دو مرتبہ اس کے بعد سحر کھانے کے بعد سے لے کر صبح کی نماز تک اور نماز کے بعد سونے تک ایک دفعہ۔ اور پھر صبح کو سونے کے بعد اٹھ کر جو عموماً دس بجے ہوا کرتا تھا، چاشت کی نماز میں سردیوں میں ایک مرتبہ، گرمیوں میں دو دفعہ۔ اس کے بعد ظہر کی اذان سے پندرہ منٹ پہلے تک ایک یا دو مرتبہ دیکھ کر پھر ظہر کی سنتوں میں ابتداء دو مرتبہ، اول کی سنتوں میں ایک دفعہ اور آخر کی دو سنتوں میں دوسری دفعہ اور بعد میں ہر دو سنتوں میں ایک ہی مرتبہ رہ گیا۔ ظہر کے بعد دوستوں میں سے کسی کو ایک مرتبہ سنانا، اور پھر عصر تک موسم کے اختلاف کی وجہ سے ایک یا دو دفعہ پڑھنا۔ عصر کے بعد کسی دوسرے اونچے آدمی کو سنانا۔ ابتداء حضرت کی حیات تک حافظ محمد حسین صاحب اجراڑوی کو، اس کے بعد دو تین سال تک مولوی اکبر علی صاحب مدرس مظاہر علوم کو، اس کے بعد بہت عرصہ تک مفتی محمد یحییٰ کو اور ان ہی کے ساتھ انکے دونوں بھائی حکیم الیاس، مولوی عاقل بھی شریک ہونے لگے۔ مغرب کے بعد نفلوں میں ایک دفعہ پڑھنا اور نفلوں کے بعد تراویح تک ایک دفعہ پڑھنا۔ تراویح کے بعد یہ پارہ ختم ہو جاتا تھا۔ اور اگلے کا نمبر شروع ہو جاتا تھا۔ ۲۴ گھنٹے میں اس کی تشکیل ضروری تھی کہ ۳۰ پارے پورے ہو جائیں۔ اللہ کے انعام و فضل سے سالہا سال یہی معمول رہا۔ اخیر زمانے میں بیماریوں نے چھڑا دیا۔

اس زمانے کا ایک لطیفہ بھی یاد آ گیا، جو کئی سال تک بہت مشہور رہا۔ میرے عزیز مخلص دوست طیب رامپوری، میرے دوسرے مخلص مولوی عامر سلمہ کے والد، اس زمانے میں ان کی آمد و رفت بہت کثرت سے تھی اور چونکہ بہت مختصر وقت کے لئے آتے تھے اور سیاست کی خبریں بہت مختصر ۶ الفاظ میں جلدی جلدی سنا جاتے تھے، اس لئے ان کی آمد میں میرے یہاں کوئی پابندی نہیں تھی۔ ایک مرتبہ رمضان میں ۸۔۹ بجے صبح کو آئے مولوی نصیر سے کہا کہ کواڑ کھلوا دو۔ اس نے کہا رمضان ہے خود زنجیر کھڑکھڑانے کا ارادہ کیا، اس نے منع بھی کیا اور یہ بھی کہا کہ ”یا تو وہ سو رہا ہوگا نیند خراب ہوگی اور اگر اٹھ گیا ہوگا تو نفلوں کی نیت باندھ لی ہوگی، کھڑکھڑاتے رہو۔“ اس پر خفا ہو کر مدرسہ میں چلے گئے۔ راستہ میں مولوی

منظور احمد خاں صاحبؒ ملے، انہوں نے کہا، ''حکیم جی تم کہاں آ گئے؟ شیخ کے یہاں تو رمضان ہے۔'' اس پر کچھ سوچ پیدا ہوئی اور نصیر پر سے کچھ غصہ کم ہوا۔ اس کے بعد حضرت ناظم صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے، وہ ڈاک لکھوا رہے تھے، فرمایا ''حکیم جی کہاں آ گئے، شیخ کے یہاں تو رمضان ہے۔'' وہاں سے اٹھ کر کر مفتی محمود صاحب کے حجرے میں گئے، مفتی صاحب کا قیام اس زمانے میں مدرسہ قدیم ہی کے حجرہ میں تھا، مفتی جی نے بھی یہ فقرہ دہرا دیا۔ حکیم جی نے پوچھا ''آخر رمضان میں کوئی وقت بات کا ملاقات کا ہو سکتا ہے یا نہیں؟'' مفتی جی نے کہا تراویح کے بعد آدھ گھنٹہ۔ حکیم جی نے کہا مجھے تو رامپور واپس جانا ہے۔ تب مفتی جی نے کہا کہ ظہر کی نماز سے پندرہ منٹ پہلے تشریف لائیں گے اس وقت مل لینا ظہر کی نماز کے بعد گھر جاتے ہوئے راستے میں مل لینا وہ ظہر سے پہلے مسجد میں آئے تو میں نیت باندھ چکا، ظہر کی نماز کے بعد میں نے پھر سنتوں کی نیت باندھ لی، بڑی دیر تک انہوں نے انتظار کیا، مگر جب دیکھا کہ رکوع کا ذکر ہی نہیں، اسلئے کہ اس زمانے میں سنتوں میں دو دفعہ پارہ پڑھنے کا معمول تھا، وہ بڑی دیر انتظار دیکھ کر مٹر گشت میں چلے گئے، وہ واپس آئے تو میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر قرآن پاک سنانے میں مشغول ہو گیا تھا، وہ بہت کھٹ کھٹ کر کے اوپر چڑھے اور جاتے ہی بہت زور سے ''بھائی جی سلام علیکم، بات نہیں کرتا صرف ایک فقرہ کہوں گا، رمضان اللہ کے فضل سے ہمارے یہاں بھی آتا ہے مگر یوں بخار کی طرح کہیں نہیں آتا۔ سلام علیکم جا رہا ہوں، عید کے بعد ملوں گا۔'' میں نے کہا ''وعلیکم السلام'' اور پھر قرآن سنانے میں مشغول ہو گیا۔

بندہ کی ابتدائی فارسی

۲۵ھ سے میری فارسی اردو اس حالت میں شروع ہو گئی کہ قرآن پاک تو گویا پڑھا بے پڑھا برابر تھا، مگر ہم حافظوں میں شمار ہونے لگے۔ میں نے فارسی زیادہ تر اپنے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے پڑھی۔ ان پر اس زمانے میں بزرگی کا بہت ہی غلبہ تھا، مجاہدات سلوک کا بہت زور تھا، خانقاہ قدوسیہ کے پیچھے ایک بہت مختصر آب چک تھی، اس میں ایک بوریے پر آنکھ بند کئے ہوئے دوزانوں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ میں سبق کے لئے جاتا تو قانون یہ تھا کہ ایک کتاب چچا کے سامنے کھول کر رکھ دیتے، ایک ساتھی میرا اور تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں، ہم دونوں دوسری کتاب میں پڑھتے۔ بیٹھنے کے بعد بسم اللہ کر کے سبق شروع کر دیتے، اگر اس میں ذرا دیر ہوتی تو چچا جان نور اللہ مرقدہٗ ایک انگلی سے اپنے سامنے کی کتاب بند کر دیتے اور گویا تاخیر کے عتاب میں سبق بند، ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے

آتے، اور کبھی دوبارہ شروع کرتے اور کتاب کھول کر دوبارہ ان کے سامنے رکھتے تو موج تھی کبھی پڑھا دیتے کبھی ''چشت'' فرما کر اٹھا دیتے۔ سبق میں اپنے ہی مطالعہ پر مدار تھا ۔معمولی غلطی پر ''چشت'' کہتے یا ''ہوں'' اور فحش غلطی پر پھر وہی ایک انگلی سے کتاب بند کر دیتے۔

اس سیہ کار میں اس زمانے میں بولنے کا مرض بہت زیادہ تھا، چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے مجھ سے فرمایا کہ ''اگر تو چھ ہفتے چپ رہے تو میں تجھے ولی کر دوں۔'' اس زمانے میں چھ ہفتے تو درکنار چھ دن بھی چپ رہنا مصیبت تھا۔ میں نے بڑے ہو کر نظام الدین ایک مرتبہ ان کو یہ ارشاد یاد دلایا ان کو یاد آ گیا، میں نے کہا کہ ''آپ نے اس وقت میں چھ ہفتے کو فرمایا تھا۔ اب میں چھ ماہ کامل چپ رہ کر دکھلاؤں۔'' چچا جان نے فرمایا کہ ''وہ بات تو گئی، وہ تو اس وقت کی تھی۔''

اس زمانے میں چچا جان دن میں سارا دن مراقبہ کرتے، نہ معلوم کیا سوچا کرتے اور مغرب سے عشاء تک نفلیں پڑھتے۔ اس زمانے میں چچا جان کو جَو کی روٹی کا اتباع سنت میں کھانے کا شوق پیدا ہوا اور ان کے ساتھ ہم نے بھی زور دکھلائے، تقریباً چھ ماہ چچا جان کا یہ دستور رہا۔ اس کے بعد کسی بیماری کی وجہ سے حکیم صاحب نے اس کو منع کر دیا، جس پر میرے والد صاحب نے بھی ان کو روک دیا اور وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ ورنہ تین چار روٹی جَو کی کھانا خوب یاد ہے اور چچا جان کے ساتھ اپنا کھانا بھی۔

گنگوہ سے سہارنپور میں آمد

رجب ۲۸ھ میں یہ ناکارہ سہارنپور آ گیا، اس لئے کہ دو تین ماہ قبل میرے والد صاحب قدس سرہٗ مستقل قیام کے ارادے سے گنگوہ سے سہارنپور منتقل ہو گئے۔ دارالعلوم کا جلسہ دستار بندی، اس میں تقریباً کتب خانہ کا بہت سا حصہ گنگوہ سے دیوبند منتقل ہوا تھا کہ اکابر دیوبند نے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی تالیفات کی اشاعت کی وجہ سے والد صاحبؒ پر اصرار کیا تھا کہ اپنا کتب خانہ اور اپنی دکان دارالعلوم کے جلسۂ دستار بندی میں لائیں۔ اس سے فراغ پر وہ سارا کتب خانہ دیوبند سے سہارنپور منتقل ہوا اور چونکہ چھکڑوں میں آیا اور دیوبند بھی چھکڑوں میں ہی گیا تھا۔ اس لئے کتابیں خراب بہت ہوئیں۔ ہزاروں کتابوں کی سلائی ٹوٹی۔

سہارنپور آ کر باقاعدہ عربی تعلیم شروع ہوئی اور اس سے پہلے ابتدائی عربی اور اس سے زیادہ تر چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے اور کم والد صاحب قدس سرہٗ سے پڑھنے کی نوبت

آئی، لیکن سہارنپور آنے کے بعد باقاعدہ ہماری ایک مستقل جماعت بنی، جس کے دوسرے ساتھی میرے حضرت قدس سرہٗ اَعلی اللہ مَرَاتِبَہٗ کے عزیز مظہر علی خاں راجو پوری تھے اور تیسرے ساتھی سید محفوظ علی گنگوہی جو بعد میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے سالے بن گئے تھے اور اس کے بعد دیوبند منتقل ہو گئے تھے۔ جب مرحوم کی ہمشیرہ کی شادی حضرت شاہ صاحب سے ہوگئی، اس وقت تک وہ سہارنپور ہی میرے والد صاحبؒ کے پاس مقیم رہے، اور اس سے پہلے گنگوہ میں بھی میرے والد صاحب ہی کے پاس پڑھتے تھے۔ یہاں آکر باقاعدہ میرے ساتھی بن گئے تھے اور مستقل جماعت ہماری تین آدمیوں کی خصوصی جماعت شمار ہونے لگی۔ سید محفوظ صاحب کے دیوبند جانے کے بعد ہم دو ہی رہ گئے۔

صرف پڑھانے کا والد صاحب کا ایک خاص طریقہ تھا۔ وہ الفاظ لکھوا دیا کرتے تھے اور کچھ قواعد لکھوا دیتے تھے۔ مثلاً اجوف، ناقص وغیرہ کے۔ میں نے میزان منشعب معروف ومتداول نہیں پڑھی۔ اس زمانے میں میرے ہی لئے غالباً ایک میزان منشعب خاص تصنیف ہوئی تھی جو دو دو ورق کی تھی آسی مدراسی پریس میں چھپی تھی اس میں میرے مقدر سے گردان بھی بجائے فَعَلَ یَفْعِلُ کے ضَرَبَ یَضْرِبُ کی تھی، میزان میں بھی وہی تھی منشعب میں ہوئی تھی جو دو دو ورق کی تھی اسی مدراسی پریس میں چھپی تھی اس میں میرے مقدر سے بھی وہی تھی اور عمل میں بھی وہی، اور اس کے بعد وہ ایسی کہیں گم ہوگئی کہ تلاش سے بھی نظر نہ پڑی۔

والد صاحب کا طرز تعلم

میرے والد صاحب کے یہاں پہلے قواعد زبانی یاد کرائے جاتے تھے اور اس کے بعد ان قواعد کا اجراء تختی یا ردی کاغذوں پر کرایا جاتا تھا، اسکے بعد پھر مجھے یاد ہے کہ صرف میر اور پنج گنج تین تین چار چار دن میں سنا دی تھیں ان میں وقت نہیں خرچ ہوا۔ اس واقعہ کی کچھ تفصیل اِکمال الشیم کے مقدمہ میں بھی گزر چکی ہے۔ البتہ فصول اکبری میں بہت وقت خرچ ہوا۔ رمضان میں تعطیل نہیں ہوتی تھی، البتہ رمضان کی کتابیں علیحدہ ہو جایا کرتی تھیں۔ میری صرف صغیر کی کاپی پر جو ابتدائی زمانہ کی مشق کی ہوئی ہے، میری طالب علمی کی کتابوں کا بھی ایک نقشہ جو مقدر سے مل گیا وہ اس جگہ درج کراتا ہوں، اتفاق سے بہت پرانی کاپی غالباً ۲۸ھ کی ہے، جس پر نقشہ ملا، شروع کے تین سال کا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ اس زمانے میں رمضان کی کتابیں بالکل الگ ہوتی تھیں پہلے رمضان میں نحو میر ہوئی تھی اسی کے ساتھ

جلسوں کی ترکیب نحو میر کے قواعد کے مطابق بنوائی گئی۔ نحو کے چند سبق میں نے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی شیخ الاسلام حال پاکستان سے بھی پڑھے ہیں۔ مولانا سے میں نے صرف نحو میر ہی کے چند سبق پڑھے۔ اور کچھ حال پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے کہ میرے والد صاحبؒ زیادہ تر خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔ مولانا ظفر احمد صاحبؒ کا حال اکمال الشیم کے مقدمہ میں خود ان کے گرامی نامے سے لکھا جا چکا ہے۔ ان کی پیدائش ان کی تحریر کے موافق ۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ ہے۔ مدرسہ مظاہر علوم میں ۵ جمادی الثانی ۲۹ھ کو مدرس مقرر ہوئے۔ ۳۵ھ میں طویل رخصت لے کر اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے۔

اَطَالَ اللّٰہُ بَقَائَہٗ

وہ نقشیہ یہ ہے

سال اول از رمضان ۲۸ھ تا شعبان ۲۹ھ	☆نحو میر تمام ☆شرح مأتہ مع ترکیب تمام ☆ہدایۃ النحو تمام ☆کافیہ کبری تمام ☆ایسا غوجی تمام ☆مرقاہ (تمام) شرح تہذیب (نصف) ☆مفید الطالبین (باب اول) نفحۃ الیمن (دو قصیدہ از باب دوم) ☆الفیہ (تمام) ☆ابن مالک (نصف) ☆فصول اکبری (ثلث) ☆ترجمہ پارۂ عم (تمام)۔ تبارک الذی (نصف) ☆مجموعہ چہل حدیث (یہ پانچ چہل حدیثوں کا مجموعہ، شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ملا جامی کا اس زمانے میں بہت مشہور اور شائع تھا)۔
سال دوم رمضان ۲۹ھ تا شعبان ۳۰ھ	☆بقیہ الفیہ ☆بقیہ شرح تہذیب ☆قطبی تصدیقات و تصورات مع میر ☆تلخیص فن اول ☆مقامات ۲۳ مقامے ☆حساب تا کسورِ عام ☆بقیہ ترجمہ تبارک الذی ☆نفحۃ الیمن باب اول، باب ثانی، باب خامس ☆قصیدہ بردہ ☆بانت سعاد ☆قصیدہ ہمزیہ۔
سال سوم رمضان ۳۰ھ تا شعبان ۳۱ھ	مختصر ☆نور الانوار ☆متنبّی ☆سبعہ معلقہ ☆حسامی ☆شرح جامی ۶/۱ حصہ ☆کنز ☆قدوری ☆میبذی ☆سلّم۔

سال چہارم رمضان ۳۱ھ تا شعبان ۳۲ھ	کاپی میں اس کی تفصیل نہیں، مدرسہ کی روائداد میں صفحہ ۱۰۱ پر اس سال کی کتب ممتحنہ یہ ہیں: ☆مشکوٰۃ شریف ☆ہدایہ اولین ☆متنبّی ☆حماسہ ☆طحاوی ☆شرح نخبہ ☆الفیہ عرفی۔ مگر اس کا امتحان نہیں دیا۔
سال پنجم رمضان ۳۲ھ تا شعبان ۳۳ھ	کاپی میں اس سال کی کتب بھی درج نہیں ہیں۔ مدرسہ کی روائد سے نقل کر رہا ہوں: ☆ملا حسن ☆حمد اللہ ☆میر زاہد ☆امورِ عامہ ☆میر زاہد ملا جلال ☆میر زاہد رسالہ غلام یحییٰ ☆مؤطأ محمد ☆طحاوی ☆اقلیدس ☆شمس بازغہ۔ مگر اقلیدس، شمس بازغہ کا امتحان نہیں دیا۔ مؤطا امام مالک کا امتحان بغیر پڑھے دیا تھا، ممتحن کو یہ علم ہو گیا تھا کہ بغیر پڑھے دیا ہے، اسلئے انہوں نے بغیر پڑھے کی رعایت کی کہ فیل کر دیا، اور کرنا چاہیے تھا۔
سال ششم رمضان ۳۳ھ تا شعبان ۳۴ھ	کتب مقروءہ از والد صاحب: اس سیہ کار نے حدیث کی کتابوں کا امتحان نہیں دیا۔ ☆ترمذی شریف ☆بخاری شریف ☆ابوداؤد شریف ☆ہدایہ ثالث (ابتدائی حصہ) ☆نسائی شریف (تمام)
سال ہفتم رمضان ۳۴ھ تا محرم ۳۵ھ	نزد حضرت اقدسؒ: بخاری شریف (دوسری مرتبہ) ☆ترمذی شریف ☆شروع سال میں حضرت اقدسؒ نینی تال جیل میں تھے۔ آخر ذی الحجہ میں تشریف آوری ہوئی تھی۔
شوال ۳۵ھ تا شعبان ۳۶ھ	نزد حضرت قدس سرہٗ ☆ابوداؤد شریف
شوال ۳۶ھ تا شعبان ۳۷ھ	نزد حضرت قدس سرہٗ ☆مسلم شریف ☆نسائی شریف

میں اِکمال الشیم کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں کہ میرے والد صاحبؒ اپنے خاص شاگردوں کے پڑھانے میں مجتہد تھے، کسی نصاب کے پابند نہیں تھے، ان کے یہاں زبانی

تعلیم زیادہ اہم تھی بہ نسبت کتابی تعلیم کے۔ ادب کے درمیان میں بہت زور تھا، نحو میر کے ساتھ ہی عربی سے اردو، اردو سے عربی بنوانے کا اہتمام تھا۔ ادب میں چہل حدیثوں کا بہت دستور تھا۔ ایک چہل حدیثوں کا مجموعہ تھا۔ جس میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ، ملا جامی، قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ کی چہل حدیث پڑھائی جاتی تھیں۔

ان کے یہاں کافیہ ہدایۃ النحو ساتھ پڑھانے کا معمول تھا۔ جتنی شام کو کافیہ پڑھائی ہوتی صبح کو اتنی ہدایۃ النحو ہو جاتی، گویا ہدایۃ النحو کافیہ کی جگہ مطالعہ ہوتا۔ اسی طرح سے کنز اور قدوری ساتھ ہوتی، اس طرح پر کہ کنز اصل ہوتی اور قدوری بمنزلہ مطالعہ کے ہوتی، جتنی شام کو کنز ہوتی اس کی ترتیب کے موافق صبح کو قدوری ہو جاتی۔

ادب کی کتابوں میں وہ محشیٰ کتابوں میں پڑھانے کے مخالف تھے۔ میں نے مقامات جو پڑھی وہ کلکتہ کی مطبوعہ میرے لئے خاص طور سے وی پی منگائی گئی تھی۔ جس میں نہ کوئی حاشیہ تھا نہ اعراب۔ سبعہ معلقہ انہوں نے اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر پڑھایا اس لئے کہ موجود، سبعہ معلقہ سب محشی تھے۔ اسی طرح متنبی بھی ان کے دست مبارک کی لکھی ہوئی پوری موجود ہے۔

کسی کتاب کا پورا ہونا حدیث کے علاوہ ان کے یہاں ضرور نہ تھا بلکہ ہر کتاب کا نصاب یہ تھا کہ جب آٹھ سبق ایسے پڑھ لو کہ استاد جو چاہے پوچھ لے اور شاگرد کچھ نہ پوچھے وہ کتاب گویا پڑھ لی، اس کے بعد ختم کرنا ضروری نہ تھا۔ اگر شاگرد کا جی چاہتا تو دوبارہ کی طرح سے فرفر سنا کر ختم کر دیتا، نہ جی چاہتا تو کچھ ضروری نہ تھا۔ البتہ حدیث پاک کے ختم کا بڑا اہتمام تھا۔

الفیہ ابن مالک اس ناکارہ نے پورا پڑھا اور اس کا سبق حرفاً حرفاً سنا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہاتھ کی ہتھیلی پر ہر شعر کا ابتدائی کلمہ لکھ لیتا تھا، پھر سارا شعر یاد آجاتا تھا۔ پڑھنے کے زمانے میں اس کی ایک اردو شرح بھی لکھی تھی۔ تالیفات میں اس کا ذکر آئے گا۔

شرح جامی کے متعلق نقشہ میں ۲/ الکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ الفیہ کے بعد ایک دفعہ کاندھلہ جاتے وقت سہارنپور کے اسٹیشن پر شرح جامی شروع ہوئی تھی، کاندھلہ کے اسٹیشن تک بغیر ترجمہ کے میں پڑھتا چلا گیا۔ ابا جان نے کہیں کہیں مطلب پوچھا، میں نے بتلا دیا۔ کاندھلہ جا کر ایک دن قیام رہا، وہاں بھی ایک گھنٹہ سبق ہوا، تیسرے دن واپسی پر کاندھلہ کے اسٹیشن سے سبق شروع ہوا تھا سہارنپور کے اسٹیشن تک ختم ہو گیا تھا۔ ان تین دن میں مرفوعات تو مطالعہ ہو گئی تھیں منصوبات کا بھی بہت سا حصہ ہو گیا تھا۔ میری شرح جامی بھی قسمت سے نہ

معلوم کہاں سے آئی تھی، بہت ہی مختصر حاشیہ۔ مجھے اس وقت پتہ نہیں چلا کہ اس میں حاصل محصول کیا چیز ہوتی ہے؟ جب مدرسی کے زمانہ میں ایک مرتبہ شرح جامی بحث اسم پڑھانے کی نوبت آئی، اس کے حواشی دیکھنے شروع کئے تو میں دیکھتا دیکھتا تھک گیا، تحریر، سنبٹ، سوال کابلی، سوال باسولی، حاشیہ عبدالرحمٰن، حاشیہ عبدالغفور، نہ معلوم کتنے حواشی دیکھے، مگر یہ حاصل محصول ختم ہوکر نہ دیا جب پتہ چلا کہ یہ بھی کوئی معرکۃ لآراء چیز ہے۔

اسی طرح اکثر کتابوں کی تعلیم میری ناقص ہی رہی۔ عبارت تیز اور صاف پڑھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ایسی تیز اور صاف پڑھتا تھا کہ استاذ کو بھی خیال ہوتا کہ خوب سمجھ کر پڑھ رہا ہے، اسی وجہ سے اب تک بھی جاہل کا جاہل رہا۔

البتہ حدیث پاک کا مجھے بھی اہتمام رہا، وہ میں نے بھی بڑی محنت سے پڑھی، اس میں بھی کئی معرکے ہیں جو عنقریب آنے والے ہیں۔

مولانا ماجد علی صاحب اُستاد منطق

میرے والد صاحبؒ نے مجھے منطق سُلّم تک پڑھا کر چھڑا دی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحبؒ کے رفیق درس حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے زمانے میں مولانا ماجد علی صاحب مانی کلاں ضلع جونپور کے رہنے والے، منطق کے امام، استاذ الاساتذہ، ان کے زمانے میں معقول و منطق شہرۂ آفاق تھی۔ انہوں نے میرے والد صاحب قدس سرہٗ سے وعدہ لے رکھا تھا کہ زکریا کو منطق میں پڑھاؤں گا اور میرے والد نے وعدہ کرلیا تھا، اس لئے انہوں نے سُلّم تک منطق پڑھا کر چھڑا دیا اور ان کا ارادہ تھا کہ دینیات سے فارغ ہونے کے بعد ایک سال کے لئے مینڈھو بھیجوں گا جہاں مولانا مرحوم مدرس تھے۔ مولانا ماجد علی صاحبؒ مناطقہ کے امام تھے ان کی صفات مناطقہ کی صفات ہونا ہی چاہیے تھا۔ مرحوم کا مشہور مقولہ تھا کہ ترمذی تو مولوی محمود یعنی شیخ الہندؒ کچھ پڑھا لیتے ہیں اور ابوداؤد مولوی خلیل صاحب یعنی میرے حضرت قدس سرہٗ اسی بناء پر انہوں نے اپنے ایک خاص شاگرد مولوی فضل الرحمٰن ٹونکی کو جنہوں نے بارہ برس تک ان سے منطق پڑھی تھی۔ ابوداؤد پڑھنے کے واسطے میرے حضرت کے پاس بھیجا تھا اور میرے حضرت قدس سرہٗ نے بھی ان کو تنہا بڑے اہتمام سے ابوداؤد پڑھائی، لیکن بخاری کے متعلق مولانا ماجد علی صاحبؒ کا مقولہ تھا کہ ''اس میں تو کچھ کہہ سکتا ہوں تو میں ہی کہہ سکتا ہوں۔'' اسی وجہ سے مولانا مرحوم میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے بار بار یہ اصرار کرتے تھے کہ ''زکریا کو جلدی بھیج دو میری خواہش یہ ہے کہ بخاری بھی میں ہی پڑھاؤں۔'' میرے والد صاحب کہتے تھے کہ منطق کا تو

میرا وعدہ ہے، لیکن دینیات سے فارغ ہونے کے بعد بھیجوں گا مرحوم کا یہ مقولہ میں نے خود بھی سنا جو میرے سامنے میرے والد صاحبؒ سے کہا کہ ''مولوی صاحب آپ اس کا حرج کر رہے ہیں، یہ میرے پاس آنے کے بعد یوں کہے گا کہ میں بخاری میں بھی تم سے ایک دفعہ دوبارہ پڑھنا چاہوں۔'' میرے والد صاحب کا ہمیشہ یہ جواب ہوتا تھا کہ ''منطق کا تو وعدہ ہے مگر بخاری کے متعلق تم اگر یوں نہ کہہ دو کہ مولوی زکریا تمہاری اس میں کیا رائے ہے تو کوئی بات نہیں۔'' اور اس پر کچھ خوش نہ ہوتے تھے۔

میرے حضرت قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ میرے والد صاحبؒ سے پوچھا کہ ''زکریا نے منطق کہاں تک پڑھی؟'' تو میرے والد صاحب نے مولانا ماجد علی صاحب سے اپنا وعدہ ذکر کر دیا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے بڑے زور سے لاحول پڑھ کر ارشاد فرمایا کہ ''منطق کے واسطے کہیں بھیجنا نہیں۔'' اس بناء پر اپنی طبیعت کے خلاف میرے والد صاحبؒ کو مجھے منطق پڑھوانی پڑی۔ اسی لئے اس نقشہ میں میرا ایک سال خالص منطق کا ہے۔

میری منطق کا سال

میرے منطق کے تین استاذ ہیں۔ قطبی میر تک تو میں نے اپنے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے مدرسہ کے اوقات میں پڑھی۔ البتہ شرح تہذیب حضرت ناظم صاحب مولانا عبداللطیف صاحبؒ سے قطبی سے پہلے خارج میں عصر کے بعد پڑھی تھی۔ وہ میرے والد صاحب کے حجرے میں تشریف لایا کرتے تھے، میرے والد صاحب کا حجرہ کتب خانے کا غربی حصہ تھا اور اس کے باہر کا حصہ جہاں اب تک کتب خانہ کی جدید عمارت آگئی اس وقت بالکل خالی تھا اسکی منڈیر پر بیٹھ کر پڑھایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر دے۔ سلم، میبذی اور میر زہد، امورِ عامہ حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی مدرس دوم مظاہر علوم سے دو سالوں میں پڑھیں۔ اس کے علاوہ منطق کی ساری کتابیں میرے مشفق استاد حضرت مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم سے اس طرح پڑھیں کہ میر زاہد، ملا جلال، ملا حسن تو مدرسہ کے گھنٹوں میں ان ہی کے یہاں ہوتی تھیں، اس کے علاوہ باقی سب کتابیں عشاء کے بعد پڑھیں۔ سردیوں کے بعد سے میرا سبق شروع ہوتا تھا، اس طرح پر کہ ایک چارپائی پر تو نیم دراز میں ہوتا تھا اور درمیانی چارپائی پر میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ بغیر کتاب کے لیٹے رہتے تھے، اس لئے کہ منطق انہوں نے بھی نہیں پڑھی تھی اور اگر میں یوں کہوں کہ منطق کی سب کتابوں میں، اپنے عمِ محترم، استاذ، نائب الشیخ چچا جان کا شریک درس ہوں تو بے محل نہیں۔ تیسری چارپائی پر حضرت ناظم صاحب لحاف اوڑھے لیٹے

ہوتے تھے۔ عشاء کے بعد سے سردیوں کے موسم میں بارہ بجے تک سبق ہوتا تھا، اور حضرت ناظم صاحب کے اعزّہ حکیم تقی اور مولوی عبدالوحید، اس زمانے میں مدرسہ میں پڑھتے تھے، میری اور چچا جان والی چارپائیاں ان ہی کی ہوتی تھیں، وہ دونوں زبان سے تو کیا کہہ سکتے تھے، دل دل میں جو کچھ کہہ سکتے ہوں وہ ظاہر ہے، مگر چونکہ طالب علم تھے اس واسطے حضرت ناظم صاحبؒ کی طرف سے تاکید تھی کہ میرے سبق تک مطالعہ دیکھیں، وہ دونوں میرے کتاب کے سبق کے ختم ہونے تک کچھ اونگھتے ہوئے دیکھتے، بیچارے بارہ بجے تک صبر کرتے۔ اور شاذ و نادر ہی ۱۲ بجے خلاصی ہوتی۔ بارہ بجے ہم تینوں استاذ شاگرد اٹھ کر بازار چلے جاتے، اور ناظم صاحب ان دونوں سے کہہ دیتے کہ آگ جلا کر ذرا سا پانی چائے کا رکھ دو۔ غصہ تو دونوں کو بہت آتا، مگر ''حکم حاکم مرگ مفاجات'' وہ چائے کا پانی رکھتے، اور چائے دم کر کے رکھتے، اور ہم تینوں بازار سے دودھ، شکر اور مٹھائی خرید کر لاتے، پیسے اکثر ناظم صاحبؒ کے ہوتے اور کبھی چچا جان کے اور کبھی میرے والد صاحب قدس سرہٗ بھی نہایت ناراضی کے ساتھ غصہ کے ساتھ اس مد میں کچھ مرحمت فرما دیتے۔ میرے والدین کا قیام اس زمانے میں اس مختصر مکان میں تھا جو مدرسہ قدیم کی مسجد کے غربی جانب ہے۔ ابا جان بارہ بجے تک تو انتظار کرتے لیکن بارہ کے دس، بارہ منٹ بعد تحقیق کے لئے تشریف لاتے۔ حضرت ناظم صاحبؒ کا قیام اس زمانے میں اس مکان میں تھا جو اب ''گاڑہ بورڈنگ'' کے نام سے مشہور ہے اور میرے مکان کے بالکل متصل ہے، میں نے ساری منطق تقریباً اسی مکان میں پڑھی۔ اگر ابا جان کو آنے پر معلوم ہوتا کہ استاد شاگرد سب بازار گئے ہوئے ہیں تو واپس چلے جاتے۔ اور اگر ہم واپس آجاتے تو کبھی ہلکی سی ڈانٹ بھی پڑتی ''ارے بھائی سبق کی تو مجبوری ہے، اس کے بعد کا وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔''

حضرت ناظم صاحبؒ اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کو بھی خطاب فرماتے کہ تم لوگوں کو بھی اٹھنا ہے حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہ کبھی ہنس کر فرمایا کرتے تھے کہ ''حضرت تکان ہو جاتا ہے اس لئے چائے کی ضرورت پیش آتی ہے۔'' ابا جان چپ ہو جاتے۔ حضرت ناظم ان پر بھی چائے کا اصرار کرتے مگر اکثر غصے میں نہیں پیتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ حمد اللہ اٹھارہ یا انیس دن میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نور اللہ مرقدہٗ کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالرحیم صاحب مرحوم بھی مدرسہ میں پڑھتے تھے، اور وہ حمد اللہ کئی دفعہ پہلے پڑھ چکے تھے، انہیں حمد اللہ سے عشق تھا۔ میرا بہت مذاق اڑایا کرتے تھے کہ حمد اللہ بھی ایسی چیز ہے کہ آدمی اٹھارہ دن میں پڑھ لے

وہ اٹھارہ برس میں پڑھنے کی کتاب ہے۔ مجھے سنا کر لوگوں سے کہتے کہ ''آپ نے اٹھارہ
ان میں حمد اللہ پڑھی ماشاء اللہ کیا کہنا۔'' مقدر کی بات کہ حمد اللہ کے امتحان میں دونوں
شریک تھے، اس سیہ کار کے نمبر بڑھ گئے اور ان کے غالباً ان کے غرور کی وجہ سے گھٹ
گئے۔ اس زمانہ میں اساتذہ پر بدگمانی کا کوئی نالائق سے نالائق بھی شبہ نہیں کرسکتا تھا، مگر وہ
مرحوم بار بار یوں کہتے تھے کہ ''عقل میں نہیں آتا کہ تیرے نمبر کیسے بڑھ گئے؟'' میرا تو خیال
یہ ہے کہ وہ مشکوٰۃ شریف پڑھتے وقت بھی حمد اللہ کا سبق سنا کرتے تھے، کہ دونوں سبقوں کے
مدرس قریب قریب بیٹھتے تھے۔

مجھے اقلیدس پڑھنے کے زمانے میں اس سے بڑا شغف ہوگیا تھا، اس لئے کہ ابتدائی
زمانہ میں صیغے بنانے کی مشق ابا جان نے بہت کرادی تھی، اس لئے اقلیدس کے زمانے میں
اسکی شکلیں گھڑنے کا بہت شوق تھا، میرے پرانے کاغذات میں میری صَرف صغیر، صرف کبیر،
اقلیدس کی کاپیاں بھی بہت پڑی ہوئیں ہیں۔ شمس بازغہ ہفتہ عشرہ تو متن وشرح دونوں پڑھیں
مگر جب یہ اندازہ ہوا کہ متن اور شرح میں زیادہ فرق نہیں اسلئے وہ ایک ہفتہ صرف متن پڑھ کر
چھوڑ دیا تھا۔ اس سال میں امتحان کی کتابوں میں مؤطأ امام مالکؒ ہے، مگر میں نے اس کو بغیر
پڑھے امتحان دے دیا تھا۔ اقلیدس شمس بازغہ کا پڑھنا تو خوب یاد ہے۔ اقلیدس کی کاپیاں بھی
بہت پڑی ہیں حضرت ناظم صاحبؒ سے دونوں کتابیں پڑھیں مگر امتحان ان کتابوں کا نہیں
ہوا۔ اور تصریح شرح چغمینی بھی تھوڑی تھوڑی حضرت ناظم صاحبؒ سے ہی پڑھی تھی۔ ان سب
کے کفارہ کے لئے اخیر سال میں اپنے حضرت قدس سرہٗ سے مؤطأ امام محمد اور طحاوی پڑھی تھی۔
طحاوی کا امتحان نہیں دیا کیونکہ اس سے پہلے سال دے چکا تھا۔

اساتذہ کرام کے احوال

یہ غالباً میں لکھوا چکا ہوں کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بار بار ارشاد
فرمایا کہ ''میں تجھے فقہ، حدیث اپنے اور حضرت کے علاوہ کسی سے پڑھنے نہیں دوں گا، منطق
کسی سے چاہے پڑھ لے، اسلئے کہ تو بے ادب اور گستاخ ہے، حدیث اور فقہ کے علاوہ
کسی اور کتاب کے استاد کی بے ادبی کرے گا اور وہ علم ضائع ہوجائے گا۔ بلا سے۔ لیکن
حدیث اور فقہ کی کوئی کتاب ضائع ہوجائے یہ مجھے گوارا نہیں۔'' اس لئے میں نے فقہ کی
اکثر کتابیں تو اپنے چچا جان سے پڑھی ہیں اور انتہائی اپنے والد صاحب سے۔ اور
حدیث کی کتابیں صرف اپنے والد صاحب اور حضرت قدس سرہٗ سے۔

اس کے علاوہ میرے صرف تین استاذ ہیں۔ نحو میر کے چند سبق مولانا ظفر احمد

صاحب تھانویؒ شیخ الاسلام پاکستان سے پڑھے ہیں جو اس وقت سہارنپور میں مدرس تھے۔ اپنے طلب کے سلسلہ میں اس کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ مولانا نے اپنی پیدائش اور تعلیم وغیرہ خود اپنے گرامی نامے میں مفصل تحریر فرمائی جس کو میں اپنے اکمال الشیم کے مقدمہ میں پورا لکھ چکا ہوں، مولانا نے اپنی پیدائش اور تعلیم وغیرہ خود اپنے گرامی نامے میں مفصل تحریر فرمائی جو کو میں اپنے اکمال الشیم کے مقدمہ میں پورا لکھ چکا ہوں، مولانا نے اپنی ولادت ۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ لکھی ہے، جو پہلے گزر چکی۔ ان کی ابتدائی تعلیم تھانہ بھون میں ہوئی اور انتہائی کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں، جس کی تفصیل مولانا کے اپنے والا نامہ میں موجود ہے جو اکمال الشیم کے مقدمہ میں لکھا جا چکا۔

ان کے علاوہ میرے منطق کے استاذ صرف دو ہیں: ایک مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلیؒ جن سے میں نے تین کتابیں مدرسہ کے اسباق کے ساتھ پڑھیں، سُلم العلوم، میبذی، میر زاہد، امور عامہ اور ان تین کے علاوہ سب حضرت مولانا عبداللطیف صاحبؒ سے پڑھیں حضرت مولانا عبدالوحید صاحبؒ منطق وفلسفہ کے امام تھے علمِ ہیئت کی کتابیں کسرے کی مدد سے مدد اتنی تفصیل سے سمجھاتے تھے کہ طالب علم کے ذہن میں ساری باتیں بہت وضاحت سے آجاتی تھیں۔ حضرت مولانا کی ولادت تقریباً ۱۲۹۰ھ میں سنبھل ضلع مرادآباد میں ہوئی۔ ابتدائی عمر میں ان کے والد نے اردو اسکول میں تعلیم دلائی اور اس سے فراغ کے بعد دنیوی کاروبار میں لگالیا۔ مگر اللہ جل شانہٗ نے علم کا اعلیٰ درجہ مقدر فرمایا تھا، اسلئے ابتداء سرائے ترین ضلع مرادآباد کے مدرسہ عربیہ میں داخل ہوئے، مگر چونکہ وہ گھر سے ڈھائی میل دور کے فاصلہ پر تھا، آمدورفت میں وقت زیادہ خرچ ہوتا تھا، اس لئے حسن پور ضلع مرادآباد کے مدرسہ میں مولانا احمد الدین سرحدی کے پاس صَرف ونحو کی تعلیم پوری کی۔ اسکے بعد کسی ماہر فن سے علومِ عقلیہ پڑھنے کا شوق ہوا، اور معلوم ہوا کہ مولانا غلام محمد صاحب ان فنون کے امام ہیں، چنانچہ ان کی خدمت میں حسن پور سے گھر والوں کو اطلاع کئے بغیر پیدل چل دیئے، دو آنے صرف پاس تھے، ایک ماہ میں لاہور پہنچے، وہاں علومِ عقلیہ کی تکمیل اور خاص طور سے علمِ ہیئت میں تبحر حاصل کیا، اور معلوم ہوا کہ لاہور کے قیام میں حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب قدس سرہٗ رائپوری بھی مولانا موصوف کے رفیقِ درس رہے۔ علومِ آلیہ کی تکمیل کے بعد حدیث شریف کی تکمیل کے لئے دارالعلوم تشریف لائے اور فراغت کے بعد تقریباً پانچ برس مدرسہ سرائے ترین میں تدریس کی خدمت انجام دی، اس کے بعد نعمانیہ امرتسر میں صدر مدرس رہے، اسکے بعد مینڈھو ضلع علی گڑھ کے مدرسہ

میں مدرس رہے، وہاں کے قیام میں جلسۂ دستار بندی ہوا، اس میں حضرت سہارنپوری، مولانا احمد حسن صاحب امروہی اور اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری نے شرکت فرمائی، اور حضرت سہارنپوری نے نواب صاحب سے جو مدرسہ کے سرپرست اور مربی تھے، مولانا مرحوم کو مظاہر علوم کے لئے طلب کیا، نواب صاحب مرحوم نے حضرت مولانا کے اصرار پر اجازت دے دی اور حضرت مولانا عبدالوحید صاحب ۱۹ ذی الحجہ ۲۸ھ کو مظاہر میں تشریف لائے۔ ذی قعدہ ۳۳ھ میں بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے استعفاء دے دیا اور ربیع الثانی ۳۵ھ میں دوبارہ تشریف لائے اور مظاہر سے پھر دوبارہ استعفاء دے کر اولاً مدرسہ شاہی مرادآباد میں اور پھر منڈھو میں چند سال مدرس رہ کر دارالعلوم مئو میں صدر مدرسی پر تشریف لے گئے اور وہاں سے علالت کی وجہ سے مکان تشریف لے گئے اور چند ماہ کی علالت کے بعد غرّۂ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ میں بعمر ۶۳ سال داعیٔ اجل کو لبیک کہا، مولانا مرحوم کی مستمر و مستقل عادت ہمیشہ نیچے نظر کر کے چلنے کی تھی۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ سے بیعت تھے۔ (منقول از مکتوب مولانا محمد حیات صاحب ناظم مدرسہ حیات العلوم مرادآباد مختصراً)

مولانا حیات صاحب نے ولادت تقریباً ۹۰ھ لکھی، لیکن وصال ۵۵ھ بعمر ۶۳ سال لکھا، اس حساب سے ولادت ۱۲۹۲ھ میں ہوتی ہے، بعد میں مولانا مرحوم کے صاحبزادے قاری مُعید صاحب نے لکھا ہے۔ مظاہر علوم میں آمد کا سال اپنی تاریخ کبیر سے لکھا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا کہ چلنے میں اور سبق میں مولانا نیچی نظر رکھتے تھے، تقریر نہایت متانت سے آہستہ آہستہ فرمایا کرتے تھے۔ مولانا مرحوم کا ایک مقولہ اس ناکارہ نے کئی بار سنا، نہایت نیچی نظر فرما کر متانت سے کئی دفعہ ہاتھ دائیں سے بائیں کر کے ارشاد فرماتے تھے کہ ”ہمیں اس کا یقین ہے، بالکل اعتراف ہے، اس میں نہ تواضع ہے اور نہ مبالغہ ہے کہ ہم لوگ ان کتابوں کے پڑھانے کے ہرگز قابل نہیں۔“ مختلف الفاظ سے اس مضمون کو دہراتے، اور پھر ایک دم منہ اوپر کو اٹھا کر جماعت کی طرف اسی طرح سے ہاتھ سے اشارہ کر کے زور سے فرماتے کہ ”یہ جو بیٹھے ہیں یہ ہم سے بھی پڑھنے کے قابل نہیں ہیں۔“ سرمہ لگانے کی مولانا مرحوم کو بہت کثرت سے عادت تھی۔

حضرت استاذ مولانا الحاج الحافظ عبداللطیف صاحب سے تقریباً منطق و فلسفہ کی کتابیں نے ساری ہی کتابیں پڑھیں جیسا کہ تفصیل سے گزر چکا۔ مولانا کی ولادت، میری تاریخ کبیر میں خود مولانا کی ارشاد فرمودہ کہیں درج ہے، مگر چونکہ علی گڑھ میں ہوں، واپسی پر اگر کسی نے ڈھونڈ کر بتلادی تو درج کی جائے گی۔ قرآن پاک حضرت حافظ صاحب نے

اپنے وطن پور قاضی ہی میں ایک بگھرے کے حافظ صاحب حافظ امانت علی صاحب سے پڑھا، جو مدرسہ تعلیم الاسلام جامع مسجد پور قاضی میں مدرس تھے اور اب تک یہ مدرسہ اسی نام سے قائم ہے۔ اس کے بعد ابتدائی فارسی اپنے والد صاحب مولانا جمعیت علی صاحب سے جو گورنمنٹ کالج بہاولپور میں شعبۂ عربی فارسی کے صدر تھے حاصل کی، پھر حضرت اقدس سہارنپوری کی بہاولپور تشریف بری کے موقع پر مولانا جمعیت علی صاحب نے حافظ صاحب کو مولانا کے سپرد کر دیا۔ اور حضرت قدس سرہٗ مولانا کو سہارنپور لے آئے اور یہاں آکر از ابتدا تا انتہا مظاہر علوم میں پڑھا۔ البتہ تین ماہ کے لئے شہر میں کچھ فتنہ کے خوف سے حافظ صاحب کو دیوبند بھیج دیا گیا، اور وہاں صحت اور آب و ہوا کی موافقت نہ ہونے کی وجہ سے واپس تشریف لے آئے۔ عمر شریف تقریباً ۷۵ سال کی ہوئی۔

(منقول از مکتوب عزیز مولوی عبدالرؤف سلمہٗ ابن حضرت مولانا عبداللطیف صاحب قدس سرہٗ)

حضرت حافظ صاحبؒ نے ۱۵ھ میں مدرسہ کے کتب خانہ سے بوستان، قال اقول، ایساغوجی، مراح وغیرہ لیں اور ۲۳ھ میں اعلیٰ حضرت رائپوری قدس سرہٗ کی تجویز سے جس کی تفصیل تحریر احکام سرپرستان میں موجود ہے، مدرس مقرر ہوئے، اور مولانا عنایت الٰہی صاحبؒ مستقل اہتمام کی طرف منتقل ہوئے۔ اور ان کے متعلقہ اسباق میں سے جلالین تو مہتمم صاحب ہی کے پاس رہی مگر شرح وقایہ، اصول الشاشی، تہذیب مولانا موصوف کی طرف منتقل ہوئی۔ اور اس کے بعد کتب متفرقہ ہوئیں، اور شوال ۳۹ھ سے مولانا موصوف کے یہاں ترمذی، بخاری پہلی مرتبہ درس میں ہوئی اسلئے کہ حضرت قدس سرہٗ کا صبح کا وقت بذل المجہود کے لئے فارغ کرلیا گیا تھا۔ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی ہمرکابی میں شوال ۲۳ھ میں حج کو تشریف لے گئے۔ ۱۳ صفر ۴۸ھ کو دہلی میں بضرورتِ مدرسہ تشریف لے گئے تھے وہاں شیخ رشید احمد صاحبؒ کی کوٹھی پر مرض ہیضہ ہوگیا، سب ڈاکٹروں نے اور طبیبوں نے جواب دے دیا۔ شیخ رشید احمد صاحب نے سو روپے پر ایک کار کر کے حضرت ناظم کو سہارنپور روانہ کیا۔ حضرت ناظم صاحبؒ کو پچھلی سیٹ پر تکیوں کے سہارے لٹایا۔ یہ ناکارہ اور چچا جان قدس سرہٗ نیچے جوتوں کی جگہ بیٹھے۔ کسی کو امید نہ تھی کہ جمنا بھی پار کر سکیں گے بالکل آخری حالت تھی، مگر جمنا کا پار کرنے کے بعد جب حضرت ناظم کو افاقہ شروع ہوگیا تو پور قاضی (وطن) کی سڑک پر پہنچ کر شدت سے اصرار فرمایا کہ ''میں گھر ہوتا آجاؤں۔'' ہم لوگوں نے شدت سے انکار کیا، مگر اللہ کی قدرت کے کرشمے کہ میں اور چچا جان ان کو سہارا دے کر مکان پر لے گئے جو سڑک کے قریب ہی ہے، سہارنپور پہنچنے پر الحمدللہ

مرض بہت تخفیف تھی لیکن ضعف اور مرض کا کچھ اثر کئی ماہ رہا۔ اس کے بعد ۲۲ صفر ۷۳ھ کو بضرورتِ مدرسہ رنگون تشریف لے گئے اور وہاں طبعیت ناساز ہوئی ۲۰ جمادی الثانی کو واپسی ہوئی اور واپسی کے بعد سے مرض کی شدت بڑھتی ہی چلی گئی، بالآخر ۲ ذی الحجہ ۷۳ دوشنبہ کی صبح ۱۰ بجے وصال ہوگیا اور ڈھائی بجے شام کو حاجی شاہ میں اس مجسمہ اخلاق کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

موطا امام محمد اپنے حضرت قدس سرہٗ سے میں نے کئی سال تک پڑھی اس لئے کہ جب حضرت قدس سرہٗ نے بذل کی مشغولی کی وجہ سے ترمذی، بخاری پڑھانی چھوڑ دی تھی تو اس زمانے میں کئی سال تک جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ موطا امام محمد ہوا کرتی تھی، اور یہ سیاہ کار ہی مستقل اس کا قاری تھا کہ جلدی اور صاف پڑھنے کی مشق تھی اور دوسروں کے پڑھنے میں دیر لگتی تھی۔ اس ناکارہ کے پڑھنے سے تین چار جمعہ میں ختم ہو جاتی تھی۔

نقشہ جو اوپر درج کیا گیا ان میں بعض کتابیں تو مدرسہ کے امتحان میں شامل ہوتی تھیں اور بعض نہیں ہوتی تھیں، اس لئے کہ جو کتابیں مدرسہ کے نصاب میں نہیں ہوتی تھیں یا امتحان کے زمانے میں یا امتحان کے بعد ہوتی تھیں وہ امتحان میں شامل نہیں ہوتی تھیں۔

میں نے اکمال کے شروع میں لکھوا دیا ہے اور بھی بعضی تحریرات میں آچکا ہے کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ مدارس کے موجود طرزِ تعلیم کے بہت ہی خلاف تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''اس سے استعداد نہیں بن سکتی کہ مدرس تو رات بھر مطالعہ دیکھے اور سبق میں ساری تقریریں کرے، اور طلباء عظام کا احسان ہے کہ وہ سنیں یا نہ سنیں، ادھر ادھر مشغول رہیں۔'' ان کا مشہور و معروف طرزِ تعلیم جو انکے خاص شاگردان مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی اور میرے چچا جان میں بھی رہا وہ یہ کہ سارا بار طالب علم کے اوپر رہے، وہ مطالعہ دیکھے، سبق کی تقریر کرے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ استاد کا کام صرف یہ ہے کہ ''ہوں'' کرے یا ''اوں ہوں'' کرے۔ اگر طالب علم زیادہ لغو بات کہے تو طالب علم کے منہ پر کتاب پھینک کر مارے، چاہے کتاب کی جلد ٹوٹ جائے یا طالب علم کی ناک ٹوٹ جاوے۔'' یہ ان کا مقولہ مشہور ہے مگر اس پر عمل میں نے نہیں دیکھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شارب خمر کے بارے میں چوتھی بار قتل کرنے کا حکم فرما دیا، مگر اس پر عمل نہیں فرمایا گیا۔

اسی طرز سے میرے والد صاحب اور چچا جان نے پڑھایا۔

میری فارسی اور ابتدائی تعلیم عربی تو چچا جان سے ہوئی، اور منطق بھی میر قطبی تک اسکے بعد منطق کی تین کتابیں سُلّم، میبذی اور میر زاہد امور عامہ حضرت مولانا عبدالوحید

صاحب سے، جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ ساری منطق فلسفہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم سے، ادب اور فقہ صرف والد صاحب سے، قُدُوری، نفحۃُ الیمن وغیرہ کے بعض سبق چچا جانؒ سے اور حدیث صرف والد صاحبؒ قدس سرہٗ اور حضرت قدس سرہٗ سے۔ مدرسہ میں حدیث کی جو کتابیں دوسرے مدرسین کے یہاں ہوتی تھیں۔ ان میں بڑی لمبی تقریریں ہوتی تھیں۔ ان کو تقریر کرتے دیکھ کر بہت منہ میں پانی بھرتا۔ بار بار والد صاحب سے اجازت لے کر میں حدیث کا کوئی سبق مدرسہ میں سن لیا کروں مگر ہمیشہ نہایت سختی سے منع کرتے بلکہ ڈانٹ کر ہر دفعہ یہ فرمایا کرتے کہ ''تو بے ادب، گستاخ ہے۔ میرا ادب تو جوتے کے زور سے کرتا ہے، اور اپنے حضرت کا دل سے کرتا ہے۔'' اور یہ ایک خاص واقع کی طرف اشارہ تھا جس کی طرف انہوں نے زبانی بھی کئی دفعہ فرمایا کہ ''اپنے حضرت کے حجرہ کی چھت پر بھی نہیں جاتا اور میری چھاتی پر بھی چڑھنے کو تیار رہتا ہے، جس کی شرح یہ تھی کہ میرے والد صاحب کا حجرہ کتب خانہ کا عربی کمرہ تھا جو اب کتب خانہ کا جُز بن گیا اور باہر کا حصہ بالکل خالی تھا جس کو میں شرح تہذیب کے سبق کے ذکر میں ذکر بھی کر چکا، والد صاحب کے حجرہ سے زینہ میں آنے کے لئے حضرت قدس سرہٗ کے حجرہ کی چھت پر آنا پڑتا تھا تو میں بجائے اس چھت کے برابر کی منڈیر پر کو ہمیشہ گزرتا تھا، تھی تو ریاکاری، اسلئے کہ حقیقی ادب تو اب تک بھی نصیب نہیں ہوا اس بناء پر میرے والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''تو بے ادب اور گستاخ ہے، اگر منطق فلسفہ کے کسی استاذ کی بے ادبی کردی اور وہ ضائع ہوگیا تو میری بلا سے لیکن اگر حدیث پاک کے کسی استاذ کی ذرا بھی تو نے بے ادبی کردی تو مجھے یہ گوارا نہیں کہ تو حدیث پاک کی برکات سے محروم ہوجاوے۔'' اور بالکل ہی صحیح فرمایا ہے۔ مجھ سے تو حقیقی ادب اپنے کسی استاذ کا نہیں ہوسکا۔ اگرچہ میری بے ادبی کے باوجود میرے استاذ مذکورین کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے بہت ہی محبت اور شفقتیں فرمایا کرتے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ اور والد صاحبؒ نور اللہ مرقدہٗ کے علاوہ ہر استاذ کا برتاؤ میرے ساتھ ایسا مساویانہ رہا جیسا کہ میں ان کا ہم عصر اور رفیقِ درس ہوں۔

ایک عجیب قصہ یا خواب

جس دن میں نے یہ میبذی شروع کی اس کی رات کو دیکھا تھا کہ میں ہاتھی پر سوار ہوں۔ ابا جان سے عرض کیا، انہوں نے فرمایا کہ ہاتھی کی شکل سُوّر جیسی ہوتی ہے۔ تیرا میبذی کا پڑھنا یہ سور کے ہم شکل پر سوار ہونا ہے۔ اللہ جانے یہی تعبیر ہوگی یا کچھ اور۔ تعلیمی

زمانے کی سرگزشتیں تو بہت لمبی ہیں، سب کا احاطہ بھی کرنا بہت مشکل ہے۔

یہ مختلف تحریرات میں پہلے گزر چکا اور یہ معروف چیز ہے کہ میری ابتدائی تربیت قیدیوں کی طرح ہوئی، بغیر والد صاحب اور چچا جان کے کہیں جانے کی اجازت نہ تھی۔ میرا انتہائی کھیل یا ابتدائی کھیل یا پورا کھیل ''بیت بازی'' تھی، ہم تینوں ساتھی مظہر اور حکیم محفوظ گنگوہی ثم الدیوبندی، جب بھی ابا جان کی نگاہ سے ذرا اوجھل ہوتے تو بیت بازی شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ حماقت سوار ہوئی کہ بیت بازی کا کھیل قرآن پاک کی آیات سے شروع کر دیا۔ یعنی ایک شخص آیت پڑھے اور آیتِ شریف کا آخری حرف جو ہو دوسرا شخص وہ آیت پڑھے جس کے شروع میں یہ حرف ہو۔ میرے دونوں ساتھی حافظ نہیں تھے اور میں بھی صرف نام کا تھا۔ مگر خوب یاد ہے کہ نہ معلوم آیتیں کس طرح سوچ لیا کرتے تھے۔ یہ حماقت تین چار دفعہ ہوئی اور پھر بالکل چھوٹ گئی۔ اور منشاء اس کا یہ ہوا کہ عجیب بات تھی کہ جس دن یہ حرکت ہوتی اس دن بلا کسی معقول وجہ کے پٹائی ہو جاتی۔ اس تجربہ نے دو تین دفعہ کے بعد ہی توبہ کرا دی۔

میری اصل محنت کا زمانہ منطق کے سال سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے محنت تو کم و بیش عربی کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی دوسرا مشغلہ تھا ہی نہیں۔ کہیں جانا آنا نہ تھا، لیکن منطق کے سال میں چونکہ کتابیں بھی بہت سی پڑھیں۔ حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سے جو کتابیں پڑھیں وہ تو مدرسہ کے سبق کے ذیل میں پڑھیں لیکن حضرت ناظم صاحب سے جو کتابیں پڑھیں وہ اپنے والد صاحب کے طرز کے موافق زیادہ تر بلا ترجمہ کے پڑھیں، لیکن مطالعہ ان کا دن میں دیکھنے کی خوب نوبت آتی تھی۔

ابتداء مشکوٰۃ

۷ محرم الحرام ۳۲ھ کو ظہر کی نماز کے بعد میری مشکوٰۃ شریف شروع ہوئی، والد صاحبؒ نے خود ہی ظہر کی امامت بھی کی تھی کہ اس زمانے میں نماز وہی پڑھایا کرتے تھے، اور نماز کے بعد غسل فرمایا، اور اس کے بعد اوپر کے کمرے میں جو آج کل مہمان خانہ ہے اس زمانے میں فارسی خانہ تھا، اور مدرسہ کے اوقات کے علاوہ میرے والد صاحب اور ہم سب کی گویا رہائش گاہ بھی تھا، اس میں اس در کی طرف جو مسجد کی طرف کھلتا ہے اور وہ مدرس اول فارسی کے بیٹھنے کی جگہ تھی ان کا گدہ وغیرہ وہاں بچھا رہتا تھا۔ اس پر کچھ بچھا کر دو رکعت نفل پڑھی، پھر میری طرف متوجہ ہو کر مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ اور خطبہ مجھ سے پڑھوایا۔ پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر پندرہ بیس منٹ تک بہت ہی دعائیں مانگیں، مجھے معلوم نہیں کیا کیا

دعائیں مانگیں، لیکن میں اس وقت ان کی معیت میں صرف ایک ہی دعا کرتا رہا کہ ''یا اللہ! حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا، اس کو مرنے تک اب میرے ساتھ وابستہ رکھیے۔'' اللہ جل شانہٗ نے میری ناپاکیوں، گندگیوں، سیئات کے باوجود ایسی قبول فرمائی کہ محرم ۳۲ھ سے رجب ۹۰ھ تک تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی ایسا زمانہ نہیں گزرا کہ جس میں حدیث پاک کا مشغلہ نہ رہا ہو۔ اگرچہ دعا کے وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، اگر میں نے پڑھ بھی لیا پھر مدرس بھی ہوگیا تو حدیث پاک پڑھانے تک دس بارہ برس تو لگ ہی جاویں گے کہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب جو یکم ج ۱۳۳۱ھ سے مدرس تھے اس وقت تک مشکوٰۃ تک نہیں پہنچے تھے، مگر اللہ جل شانہٗ مسبب الاسباب ہے کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ فرماوے تو اسباب تو خود اس کی مخلوق ہے۔

۳۲ھ میں مشکوٰۃ پڑھی۔ ۳۳ و ۳۴ھ میں دورہ۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ ۳۵ھ سے بذل شروع ہوئی جو ۴۵ھ میں ختم ہوئی اور اس کے بعد اوجز کی تالیف شروع ہوئی جو ۷۵ھ میں ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی دوسرے علم حدیث کے تالیفی سلسلے بھی شروع ہوتے رہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب تک ساتھ دے رہے ہیں، اور شوال ۴۱ھ سے علم حدیث کی تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو ۸۸ھ تک رہا۔ اور اسکے بعد نزول آب کی وجہ سے تدریس کا مبارک سلسلہ چھوٹ گیا۔ اللہ ہی کا شکر و احسان ہے کہ اب ۹۰ھ تک تو حدیث کی تالیف کا سلسلہ باقی ہے، دیکھیئے میری بداعمالیاں اس کو آگے باقی رہنے دیں گی یا نہیں۔

دورہ کا سال

شوال ۳۳ھ میں میرے دورہ کا سال شروع ہوا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ نہ تو مجھے کہیں ملازمت کرنی ہے نہ مدرسی کا شوق، اس لئے دورہ کی کتابیں ایک سال میں پڑھنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ ابوداؤد شریف میرے والد صاحبؒ کا خاص سبق تھا، جو میرے حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں بھی اہتمام سے میرے والد صاحبؒ ہی کے پاس ہوتا تھا۔ شوال ۳۳ھ میں حضرت قدس سرہٗ نے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی معیت میں حجاز کا وہ مشہور و معروف معرکۃ الآراء سفر کیا جس میں کابل کی طرف سے آکر ہندوستان پر حملے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اور اس کے قصے اب تو مشہور و معروف ہو چکے ہیں، حضرت مدنی قدس سرہٗ کی مختلف تصانیف میں اور مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمیعۃ العلماء کی تصانیف میں مختصر و مطوّل آچکے ہیں اور حضرت قدس سرہٗ کی غیبت میں حضرتؒ کے اسباق ترمذی، بخاری بھی میرے والد صاحبؒ کے پاس آچکے تھے۔ لیکن

میرے ذہن میں چونکہ سارے دورہ کی کتابیں ایک سال میں پڑھنا نہیں تھا، اس لئے میں نے صرف ابوداؤد میں شرکت کی اور والد صاحبؒ نور اللہ مرقدہٗ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو بہت خوشی سے انہوں نے اس کی اجازت دی۔ چند ہی روز بعد میرا کاندھلہ جانا ہوا تو میرے پھوپھا مولانا رضی الحسن صاحبؒ نے مجھ سے یہ فرمایا کہ ''تو نے ترمذی بخاری یحییٰ سے کیوں نہیں پڑھی؟'' میں نے اپنا منصوبہ بتایا۔ انہوں نے فرمایا، ''میرا اندازہ یہ ہے انہیں اس بات کا احساس ہے کہ تو نے ان سے ترمذی نہیں پڑھی۔'' مجھے بڑی حیرت ہوئی، بڑا تعجب ہوا۔ میں اسی دن آنے والا تھا اس لئے کہ ایک ہی شب کے لئے گیا تھا، مگر میں نے کاندھلہ سے ہی ایک خط والد صاحبؒ کی خدمت میں بہت ضرور کا لکھا کہ پھوپھا صاحب سے یہ معلوم ہو کر بڑی حیرت ہوئی، میں نے جو کچھ کیا جناب والا کی اجازت سے ہی کیا۔ وہ خط میری واپسی کے ایک دن بعد پہنچا۔ اس کو پڑھ کر میرے والد صاحبؒ نے فرمایا کہ ''نہیں، میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی، میاں یحییٰ کو کسی بات سے شبہ ہوا ہے۔'' مگر میں نے اندازہ یہ کیا کہ پھوپھا صاحب کی روایت صحیح ہے، اور والد صاحبؒ پر اس کا احساس ضرور ہے، اس لئے میں نے اپنی تجویز کے مطابق ابوداؤد شریف کے ساتھ ترمذی بھی شروع کر دی۔ ترمذی شریف کے بعد بخاری شریف اور ابوداؤد شریف کے بعد نسائی شریف والد صاحبؒ کے یہاں ہوئی اور چونکہ بخاری شریف پہلی دفعہ ہوئی تھی اس لئے والد صاحبؒ نے نسائی شریف کا گھنٹہ بھی بخاری جلد ثانی کو دے دیا اور نسائی شریف جمعہ جمعہ پوری کرائی۔ بخاری شریف جلد ثانی میں کتاب التفسیر میں آدھے صفحہ سے زیادہ ایک گھنٹہ میں سبق کسی دن میں نہ ہوتا تھا۔ آیات کا پڑھنا اور اس کے بعد امام بخاری کی تفسیر کے متعلق کلام فرمانا۔ حافظہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اچھا تھا اس لئے آیت کے پڑھنے میں تو ان کو دیر نہیں لگتی تھی، فوراً پڑھتے تھے۔ اس لئے کہ قرآن پاک بہت ازبر تھا۔ البتہ آیات کی مشہور تفسیر اور امام بخاریؒ کی تفسیر میں ان دونوں میں تطابق میں دیر لگتی تھی۔

میرے والد صاحب کی تدریس بخاری

اس زمانے میں میرا ایک رفیقِ درس حسن احمد مرحوم سہارنپوری محلّہ کھالہ پار کا رہنے والا بہت ہی متین، نیک اور میرے والد صاحبؒ قدس سرہٗ کا گویا عاشق زار، اتنا معتقد کہ حد نہیں۔ دورہ سے پہلے تو میری مرحوم سے جان پہچان کچھ زیادہ نہ تھی، صرف ایک نیک طالب علم سمجھتا تھا۔ مگر دورہ میں اس کے جوہر کھلے۔ مرحوم میرے پاس ہی بیٹھتا تھا اور میرے والد

صاحبؒ کی تقریر نقل کرتا تھا۔ میں نے اس کو جوانی کے زمانے میں کبھی کوئی فحش مذاق کرنے نہ دیکھا نہ سنا۔ میرے اور مرحوم کے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے دورہ میں دو اہتمام تھے۔

حدیث کے سبق میں وضو کا اہتمام

ایک یہ کہ کوئی حدیث ایسی نہ ہو کہ استاد کے سامنے پڑھنے سے رہ جائے، دوسرے یہ کہ بے وضو کوئی حدیث نہ پڑھی جائے۔ میرا اور مرحوم کا دستور یہ تھا کہ ہم میں سے جس کو وضو کی ضرورت پیش آجاتی، اس لئے کہ ۶،۵ گھنٹے مسلسل سبق ہوتا، وہ دوسرے کو کہنی مار کر ایک دم اٹھ جاتا اور دوسرا ساتھی فوراً ابا جان پر کوئی اشکال کر دیتا اگرچہ اس کی نوبت تو بہت کم آتی تھی مہینے دو مہینے میں اس کی نوبت آتی تھی اس لئے کہ صحت اچھی تھی اس سیدکار کا تو اس زمانے میں ظہر کی وضو سے عشاء پڑھنے کا معمول سالہا سال رہا پھر بھی کبھی نہ کبھی ضرورت پیش آجاتی والد صاحب پہلی ہی مرتبہ میں سمجھ گئے تھے کہ ایک دم ایک ساتھی اٹھا ایک منٹ میں آستینیں اتارتا ہوا بھاگا ہوا آرہا ہے اس سے ان کو بھی اندازہ ہو گیا تھا اور اس چیز سے ان کو مسرت بھی تھی ایک دفعہ حسن احمد مرحوم اللہ تعالیٰ اس کو بہت ہی درجے عطاء فرماوے میرے کہنی مار کر ایک دم اٹھا اور اس کے اٹھتے ہی میں نے والد صاحبؒ نور اللہ مرقدہٗ سے عرض کیا کہ حضرت! فتح القدیر میں یوں لکھا ہے اور بالکل بے سوچ کہا، میرے بھی ذہن میں بالکل نہیں تھا کہ فتح القدیر میں کیا لکھا ہے، لیکن میرے اس فقرہ پر کہ "حضرت فتح القدیر میں یوں لکھا ہے۔" میرے والد صاحب بے ساختہ ہنس پڑے اور کتاب میں نشان رکھ کر اور اس کو بند کر کے مجھ سے فرمایا کہ "جب تک حسن احمد آئے میں تمہیں ایک قصہ سنا دوں، میں تمہاری فتح القدیر سے کہاں لڑتا پھروں گا۔" میرے والد صاحبؒ کا دستور اسباق میں قصے سنانے کا بہت کثرت سے تھا اور میرے حضرت قدس سرہ کا بالکل نہ تھا اور میں نے حدیث پاک دونوں سے پڑھی۔ اس لئے سال کے شروع کے تین چار ماہ تو والد صاحبؒ کا اتباع رہا اور اخیر سال میں حضرت قدس سرہٗ کا۔ بہر حال والد صاحبؒ نے فتح القدیر کی بحث کی جگہ ایک قصہ سنا دیا۔ ہم دونوں کی وضو میں آدھے منٹ سے زائد بھی نہ لگتا تھا، اس لئے کہ اوپر ہی لوٹوں میں پانی بھرا رہا کرتا تھا، آداب کی رعایت تو اب تک بھی نصیب نہیں ہوئی اور وضو کی چار فرائض پر ہاتھ پھیرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ اس کے بعد والد صاحبؒ قدس سرہٗ کا معمول یہ ہو گیا کہ ہم دونوں میں سے جو بھی اٹھتا، والد صاحبؒ ایک قصہ سنا دیتے تھے۔ لیکن حضرت قدس سرہٗ کے دورہ میں اس کی پابندی تو رہی کہ کوئی حدیث ایسی نہیں ہوئی کہ جو استاذ کے سامنے نہ ہوئی ہو۔ لیکن وضو کا یہ اہتمام نہ ہو سکا، اگرچہ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں صرف

ی گھنٹے سبق ہوتا تھا، اس لئے وضو کا ٹوٹنا بھی یاد نہیں اور والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں ۵، ۶ گھنٹے ہوتا تھا۔ میری مسلم شریف اور ابن ماجہ والد صاحبؒ کے یہاں نہ ہوسکی، اسلئے کہ مسلم شریف اس سال ناظم صاحب کے یہاں پہلی دفعہ گئی ہوئی تھی اور ابن ماجہ کئی سال سے مولانا ثابت علی صاحب کے یہاں ہوتی تھی اور یہ میں لکھوا چکا ہوں کہ والد صاحب نے طے کر رکھا تھا کہ حدیث کی کتاب میرے اور حضرت کے علاوہ کسی سے نہ ہوگی۔

دورہ کے ختم پر اس سیہ کار نے اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ہدایہ ثالث شروع کی، اس زمانے میں مطالعہ کا چسکا پڑ گیا تھا۔ حدیث کی کتابیں ہو چکی تھیں، دن بھر خوب مطالعہ دیکھتا تھا اور مغرب کے بعد موچیوں کی مسجد میں جہاں میرے والد صاحبؒ کا قیام اکثر رہتا تھا، ہدایہ کا سبق ہوتا تھا، میں تنہا ہی تھا، ہدایہ پر نقلی اور عقلی، احادیث کے اور کفایہ اور عنایہ کے، فتح القدیر کے خوب اعتراضات کیا کرتا تھا۔ والد صاحبؒ نور اللہ مرقدہٗ نے دو دن کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ ”طالب علموں کی طرح پڑھنا ہو تو پڑھ مُدَرِسوں کی طرح پڑھنا ہو تو اپنے آپ جا کر اشکال جواب دیکھتے رہو۔“

مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنے کسی استاذ پر کبھی دل میں اعتراض پیدا نہ ہوا، نہ یہ گھمنڈ پیدا ہوا کہ میرے اشکال کا جواب استاذ سے نہیں آیا، یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے۔

۱۰ ذی قعدہ کو میرے والد صاحب قدس سرہٗ کا انتقال ہو گیا، یا تو ایک سال پہلے یہ جذبہ تھا کہ ترمذی شریف، بخاری شریف حضرتؒ ہی سے پڑھنی ہے اور ابا جان سے شروع نہ کی، لیکن ان کے انتقال کے بعد دستور یہی ہے کہ قدر اور محبت زندگی میں کم ہوتی، انتقال کے بعد بڑھ جاتی ہے، اب یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ترمذی شریف، بخاری شریف پڑھ لی، دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، ورنہ والد صاحبؒ کی حیات میں یہ جذبہ تھا کہ حضرت کی واپسی پر دوبارہ پڑھوں گا۔ مگر والد صاحبؒ کے انتقال کے بعد یہ خیال دل سے نہ یہ کہ نکل گیا، بلکہ اس کا عکس دل میں جم گیا۔

حضرت سے دوبارہ احادیث پڑھنا

حضرت قدس سرہٗ کی نینی تال سے واپسی پر ترمذی شریف جواب تک میرے والد صاحبؒ کے انتقال کے بعد سے بند تھی، حضرت کے یہاں شروع ہوئی اور حضرت نے تشریف لاتے ہی اس سیہ کار کو اور میرے عزیز دوست مخلص اور رفیق حسن احمد مرحوم کو دونوں کو یہ حکم فرمایا کہ ”ترمذی شریف، بخاری شریف مجھ سے دوبارہ پڑھو۔“ انکار کی تو کیا مجال تھی اور اس کا شائبہ بھی کسی حرکت سے ظاہر نہیں کر سکتے تھے کہ دوبارہ پڑھنے کو جی نہیں

چاہ رہا۔ اسی زمانے میں اس سیہ کار نے خواب دیکھا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ ارشاد فرمارہے ہیں کہ ''مجھ سے دوبارہ بخاری شریف پڑھ۔''

حضرت شیخ الہندؒ مالٹا تشریف لے جاچکے تھے، بہت سوچتا رہا کہ خواب کی تعبیر کیا ہوگی؟ حضرت قدس سرہٗ سے خواب عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس کی تعبیر بھی یہی ہے کہ مجھ سے بخاری شریف دوبارہ پڑھو۔ اس وقت تو اپنی حماقت سے تعبیر سمجھ نہ آئی، لیکن بعد میں سمجھ میں آگیا کہ اس وقت شیخ الہند فی الحدیث کا مصداق، حضرت قدس سرہٗ کے علاوہ اور کون ہوسکتا تھا۔ بہرحال، تعمیل ارشاد میں شروع تو ہم دونوں نے کردیا، لیکن میرا رفیق حسن احمد مرحوم اس سال فنون کی کتابیں پڑھتا تھا اور وہ بخاری شریف کے نیچے کسی مطالعہ کی کتاب کو رکھتا تھا۔ میں اس پر شدت سے انکار کرتا تھا۔ کہ یہ تو بہت بے ادبی ہے، حدیث پاک کی بھی اور استاذ کی بھی، ایسا ہرگز نہ کر۔ مگر اس کو میرے والد صاحبؒ سے عشق تو ان کی زندگی میں ہی تھا اور ان کے انتقال کے بعد میری طرح یہ جذبہ اور بھی بڑھ گیا تھا کہ اب تو حدیث کسی سے نہیں پڑھنی۔ میں نے اس کے بالمقابل یہ کوشش کی کہ اتنے قوی اشکالات دمادم کروں کہ حضرت قدس سرہٗ تبحر علمی کو دیکھ کر یوں فرمادیں کہ تجھے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، تقریباً یہ سال میرا ایسا گزرا کہ رات دن میں دو ڈھائی گھنٹہ سے زیادہ سونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے کہ مدرس ہوگیا تھا۔ جس کا قصہ آگے آرہا ہے اور دو سبق میرے دو استادوں کے یہاں سے اصول الشاشی چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں سے علم الصیغہ مولانا ظفر احمدؒ صاحب کے یہاں سے منتقل ہوکر آئے تھے اور دونوں میری بے پڑھی کتابیں تھیں، جس کی تفصیل آئندہ تدریس میں آئے گی۔ اصول الشاشی کے مطالعے میں کئی گھنٹے خرچ ہوتے۔ لیکن عشاء کے بعد سے رات کے تین چار بجے تک میں ترمذی شریف، بخاری شریف کا مطالعہ دیکھا کرتا تھا اور فتح الباری، عینی، قسطلانی، سندھی کے ابواب بہت ہی بالاستیعاب اور غور سے دیکھتا اور جہاں کوئی اشکال پیش آتا، اس کو نوٹ کرلیتا۔ جواب نوٹ نہ کرتا اور صبح کو حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں، اللہ مجھے بہت ہی معاف فرمائے۔ دمادم اعتراضات کرتا، مگر اللہ کا بڑا ہی احسان ہے، اسی کا لطف وکرم ہے۔ اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ ، مجھے اس کا کبھی واہمہ نہیں ہوا کہ حضرتؒ سے میری بات کا جواب نہیں آتا۔ جب شیطان ذرا سا وسوسہ کا شبہ بھی ڈالتا تو میں اپنے دل سے کہتا ''بے غیرت ساری رات تو کتاب دیکھی تجھے اعتراض کرتے شرم نہیں آتی۔'' دو ڈھائی ماہ اسی مناظرے میں گزار دیئے۔ اس واقعہ کو مولانا عاشق الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے تذکرۃ الخلیل میں بھی کچھ اجمالاً لکھا ہے۔

میرا اور حسن احمد مرحوم کا یہ معمول تھا کہ سبق کے بعد ہم دونوں حضرت کے پیچھے

پیچھے دارالطلبہ سے مدرسہ قدیم تک آتے، حضرت قدس سرہٗ، دو ماہ کے بعد حسب معمول دارالطلبہ سے تشریف لا رہے تھے اور ہم دونوں پیچھے تھے، مدرسہ قدیم کے قریب املی کی ٹال جہاں آج کل آرا مشین لگ گئی ہے، اس کے بالمقابل حضرت کھڑے ہو گئے اور ہم دونوں کی طرف متوجہ ہو کر یوں ارشاد فرمایا کہ ''ساری عمر سے یہ تمنا رہی کہ ابوداؤد شریف پر کچھ لکھوں اور کئی دفعہ شروع بھی کیا مگر پورا نہ ہو سکا۔ حضرت گنگوہیؒ کی حیات میں ہمیشہ تقاضا رہا کہ لکھوں اور جو اشکال ہوگا حضرت سے پوچھتا رہوں گا۔ حضرت کے بعد طبعیت سرد ہو گئی۔ لیکن پھر خیال ہوا ہمارے مولانا یحییٰ صاحب تو حیات ہیں جہاں اشکال ہوگا ان سے الجھتے رہیں گے۔ مگر ان کے انتقال پر تو خیال بالکل ہی نکل گیا تھا۔ اب یہ خیال ہے کہ اگر تم دونوں میری مدد کرو تو شاید لکھ سکوں۔'' حضرت کا ارشاد صحیح تھا اس لئے کہ میں نے خود حضرت کے مسودات میں ایک مسودہ دیکھا تھا جس پر ''حَلُّ الْمَعْقُوْد فِیْ اَبِیْ داوٗد مَرَّۃً ثَالِثَۃً'' کا لفظ لکھا ہوا تھا، مسودہ کو دیکھا جائے جو مدرسہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، نام میں کچھ اشتباہ ہے، علی گڑھ سے واپسی پر اگر وقت ملا تو میں خود دیکھ کر تصحیح کرا دوں گا، اگر کوئی دیکھنا چاہے تو مدرسہ کے کتب خانہ میں دیکھ لے۔ میں نے عرض کیا کہ ''حضرت! ضرور اور یہ میری دعا کا ثمرہ ہے۔'' حضرت نے فرمایا ''اس کا کیا مطلب؟'' میں نے مشکوٰۃ شریف کی ابتدائی دعا کا ذکر کر کے عرض کیا کہ'' حضرت اب تک اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، اب سمجھ میں آ گئی کہ آٹھ دس برس تو حضرت کو اس شرح میں لگ ہی جائیں گے اور اس وقت انشاء اللہ یہ ناکارہ بھی حضرت کی برکت سے حدیث پڑھانے تک پہنچ ہی جائے گا۔'' حضرت کا چہرہ مسرت سے کھل گیا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ خوبصورت بہت تھے۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا مقولہ میرے حضرت کے متعلق کہیں طبع شدہ بھی میں نے دیکھا ہے اور سنا بھی ہے کہ مولانا خلیل احمد صاحب تو گلاب کا پھول ہیں۔ اس لئے کہ حضرت قدس سرہٗ کے چہرے پر غصہ اور خوشی ایسی صاف نظر آیا کرتی تھی کہ بے تکلف محسوس ہوا کرتی تھی۔

ابتداء تالیف بذل المجہود

حضرت قدس سرہٗ نے اگلے دن مجھے بلا کر کتب خانہ سے کتابوں کے نکالنے کی ایک فہرست مجھے لکھوائی۔ چنانچہ ۲ ربیع الاول کو مدرسہ کے کتب خانہ سے کتابیں لی گئیں اور دارالطلبہ کے خزانے والے کمرہ میں بذل المجہود کی تالیف کی ابتداء ۳ یا ۴ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد بھی میں اسی جذبہ اور کوشش میں کہ حضرت دوبارہ نہ پڑھنے کی اجازت دے دیں۔ میرے ساتھی میرے بے جا سوالات پر بہت ہی چیں بجبیں ہوتے، خاص طور پر مجھے

بخاری شریف میں اشکالات کی زیادہ سہولت پیدا ہوگئی، دو گھنٹے میں سبق ایک صفحہ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ جمادی الاول آ گیا اور بخاری شریف کے چند پارے ہوئے۔ حضرت قدس سرہ، نے ایک دفعہ یوں ارشاد فرمایا کہ ''میں تو رجب میں بہاولپور کا وعدہ کر چکا ہوں، کتاب بہت باقی رہ گئی۔ میرے بعد مولوی ثابت علی صاحب، مولوی عبداللطیف سے پوری کر لیجیو۔'' اس فقرہ سے زمین پاؤں سے نکل گئی، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ جو آپ سے بھی پڑھنا نہ چاہتا ہو وہ اگلے سے کیا پڑھے گا۔

میرا اور حسن احمد کا معمول دارالحدیث میں حضرت قدس سرہٗ کے داہنی طرف بیٹھنے کا تھا، وہاں ایک الماری رکھی رہتی تھی، اس میں حضرت قدس سرہٗ کی اور میری اپنی کتابیں رہتی تھی، اسلئے کہ میرے مطالعہ کی کتاب دوسری میرے گھر پر تھی۔ یہ منظر بھی ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ حضرت قدس سرہٗ کا معمول ہمیشہ جنوبی زینہ کی طرف جانے کا تھا اور اوپر جا کر ہمیشہ دارالحدیث کے پہلے دروازے سے داخل ہوتے، طلباء ایک دم کھڑے ہو جاتے، تپائیاں ہٹا دیتے، حضرت کے لئے ایک دم راستہ کھل جاتا۔ ارشادِ بالا کے بعد جب دوسرے دن حضرت سبق کو تشریف لے گئے اور دارالحدیث کے پہلے دروازے سے اندر قدم رکھا اور سامنے میں اپنی جگہ پر نہیں تھا تو وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے اندر گھوم رہا ہے کہ حضرت اپنی جگہ ششدر کھڑے رہ گئے، قدم آگے نہیں بڑھایا، اسلئے کہ شروع محرم سے آج پہلا دن تھا کہ میں اپنی جگہ نہیں تھا، میں یہ منظر دیکھ کر جہاں بیٹھا تھا وہاں سے کھڑا ہوا، حضرتؒ نے مجھے دیکھ لیا اور قدم آگے بڑھایا، اسلئے کہ آج یہ ناکارہ حضرت کے سامنے جماعت کے بیچ میں بیٹھا ہوا تھا اور حضرت کے بیٹھتے ہی رمضانی حافظوں کی طرح سے جو میں نے بخاری شریف پڑھنی شروع کی کہ نہ کوئی اشکال تھا، نہ کوئی شبہ تھا۔ کبھی آدھا پارہ، کبھی پون پارہ، دونوں گھنٹہ میں ہی پڑھتا تھا، کسی اور کو پڑھنے بھی نہیں دیا، جمادی الثانی میں بخاری شریف ختم کر دی۔

ایک دفعہ احتیاطاً حضرت کے کان میں ڈال بھی دیا کہ ''حضرتؒ کا سفر تو تجویز ہو گیا اور بخاری شریف حضرتؒ سے ہی پوری کرنی ہے۔'' مگر حضرتؒ نے اس پر لَا یا نَعَمْ نہیں فرمایا۔

تیسرا دور شروع ہوا

میں نے شوال میں حضرتؒ سے عرض کیا کہ ''حضرت! بذل کے لئے وقت بہت تھوڑا ملتا ہے، اس لئے بذل پہلے صرف تیسرے چوتھے گھنٹے میں ہوتی تھی، میرا خیال ہے کہ ترمذی شریف حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے حوالے کر دیں۔ اور بجائے صبح کے شام کو

ابوداؤد شریف پڑھادیا کریں، میری ترمذی شریف، بخاری شریف تو حضرت کے پاس ہوگئی، میری تمنا یہ ہے کہ بقیہ کتابیں بھی ہر سال ایک ایک کتاب ہوکر پوری ہوجائیں۔'' حضرت نے بڑی مسرت سے اس کو قبول فرمالیا اور اس لئے کہ ایک تو اس میں بذل کے لئے زیادہ وقت ملتا تھا جو حضرت کے عین تمنا تھی، دوسرے اس سیہ کار کے اوپر حضرت کی شفقت بے پایاں کی وجہ سے ابوداؤد کے پڑھانے سے حضرت کو مسرت تھی، اس لئے شوال ۳۵ھ سے حضرت کے یہاں ابوداؤد ہوئی، شعبان تک، اور شوال ۳۶ھ میں، میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت کے یہاں اس سال مسلم شریف ہوگی، حضرت نے فرمایا کہ بہت اچھا۔ اور اس سال مسلم شریف اور نسائی شریف حضرت کے پاس پڑھی، ابن ماجہ شریف دونوں بزرگوں کے پاس پڑھنے کی نوبت نہیں آئی، البتہ مدینہ پاک میں ۴۵ھ میں بذل المجہود ختم ہونے کے بعد ابن ماجہ حضرت قدس سرہٗ سے شروع کی تھی اور چند سبق پڑھے تھے۔ لیکن پھر ماہ مبارک آگیا اور پھر حضرت کی طبیعت ناساز ہوگئی اس لئے پوری نہ ہوسکی۔

طحاوی سے میرے والد اور انور کشمیریؒ کا شغف

طحاوی شریف اولاً میں نے اپنے والد صاحبؒ سے مشکوٰۃ کے ساتھ پڑھی۔ میرے والد صاحبؒ کو اور حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کو طحاوی شریف سے بہت خصوصی تعلق تھا، اسی بناء پر گنگوہ کے قیام میں والد صاحبؒ نے طحاوی کا اردو ترجمہ بھی شروع فرمایا تھا۔ اس کا اشتہار بھی دیا گیا تھا۔ اس کا بہت سا حصہ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے بھی ابا جان کی تعمیل حکم میں لکھا، مگر مقدمہ سے پورا نہ ہوسکا۔ اَسانید کو چھوڑ کر مُتونِ حدیث کا خلاصہ اور امام طحاویؒ کی نظر کو تفصیل سے لکھنا یہ موضوع تھا۔ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ طحاوی کی دونوں جلدیں داخل درس ہوں، میں دارالعلوم میں اس پر قابو نہ پاسکا، تم مظاہرِ علوم میں مجھ سے زیادہ بااختیار ہو اور حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ صحیح فرمایا تھا، اس زمانے میں ایسا ہی تھا۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ کی تعمیل ارشاد میں، میں نے مظاہرِ علوم میں طحاوی شریف کا مستقل گھنٹہ کیا تھا، لیکن باوجود کوشش کے دونوں جلدیں پوری ہونے پر میں بھی قابو نہ پاسکا، کئی دفعہ تقسیم اسباق میں، میں نے یہ پیش کش کی ابوداؤد اور پھر بخاری شریف کی جگہ مجھے طحاوی دی جائے، مگر اہلِ مدرسہ نے ان دونوں کتابوں کو طحاوی سے زیادہ اہم سمجھا اور ایک سبق سے زائد یہ ناکارہ بھی اپنی تالیفی سلسلہ کی وجہ سے پڑھانے کے لئے تیار نہ تھا۔ خدا کرے آئندہ کوئی طحاوی شریف کا شوقین اس کی دونوں جلدوں کو پورا کرادیا کرے۔ مشکوٰۃ

والے سال میں اپنے والد صاحبؒ نور اللہ مرقدہٗ سے تقریباً ایک جلد پوری اور دوسری کا کچھ حصہ پڑھا اور اس کے بعد مؤطأ امام محمد کے ساتھ کچھ حصہ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں پڑھا۔ حضرت قدس سرہٗ کا معمول اول ترمذی شریف، اس کے بعد بخاری شریف اور اس کے ختم پر مؤطأ امام محمد اور طحاوی شریف پڑھانے کا سلسلہ چند سال رہا، اس لئے بندہ نے طحاوی شریف کا معظم حصہ اولاً اپنے والد صاحبؒ سے تقریباً ڈیڑھ جلد پڑھی اور اس کے بعد تبرکاً..... کا دوسرے سال میں کچھ حصہ حضرت قدس سرہٗ سے پڑھی۔

یہ تو طالب علمی کا دور تھا، جو بہت ہی عجلت میں چند واقعات لکھے۔

اب مدرسی کی سنو

محرم ۱۳۳۵ھ کے شروع میں یہ ناکارہ مدرس ہوا۔ جب میری مدرسی کا اور میری طرف اسباق منتقل ہونے کا اعلان ہوا تو میرے عزیز محترم دوست مولوی ادریس صاحب کاندھلوی مؤلف التعلیق الصبیح، جو آج کل جامعہ اشرفیہ لاہور میں اعلیٰ مدرسین میں شمار ہیں، حدیث وتفسیر کی کتابیں کثرت سے پڑھاتے ہیں انہوں نے بہت اخلاص ومحبت سے ایک نصیحت کی جس نے مجھے بہت کام دیا۔ انہوں نے کہا ”میاں صاحب! ایک بات غور سے سن لو، تم نے جس طرح خود پڑھا ہے، مدرسوں میں یہ طرز نہیں چلنے کا۔ طالبِ علم دمادم شکایتیں کریں گے اور نالائق بن کر مدرسہ سے الگ کردیئے جاؤ گے، میری ایک نصیحت جو مدارس کے طرزِ تعلیم اور طلباء کے مزاج کے موافق ہے اور جس سے تم طالب علم کی نگاہ میں محبوب بن جاؤ، تم اس کی ذرا پرواہ نہ کرنا کہ طالب علم نے مطالعہ دیکھا یا نہیں دیکھا، سبق یاد کیا یا نہیں۔ اگر تم نے طلباء سے مطالعہ پر وہ گرفت کی جو تم سے کی گئی تو تمہارے خلاف طلباء میں شور مچ جائے گا۔ وہ یہ نہیں کہنے کے کہ ہم سے مطالعہ کی گرفت کی جاتی ہے یا ہم سے گزشتہ سبق سنا جاتا ہے، وہ تمہیں نالائق ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اور تمہارے خلاف پڑھا نہ سکنے کی، سمجھا نہ سکنے کی شکایت کریں گے۔ اس لئے میری مخلصانہ نصیحت کو اہتمام سے سن لو کہ جو تمہارے منہ میں آئے کہتے چلے جانا، یہ نہ سوچنا کہ یہ طالب علم کی استعداد کے موافق ہے یا اس سے اونچی بات ہے۔ یہ بھی نہ پوچھنا کہ کل میں نے کیا کہا تھا، کس نے یاد کیا کس نے نہیں۔“

اس نصیحت نے مجھے اخیر تک بہت کام دیا۔ میری جہالت پر ان کی نصیحت نے بہت ہی پردہ ڈالے رکھا۔

میرے ابتدائی تقرر کے وقت جو محرم سے ہوا تھا، دو سبق ایک میرے چچا جان

نوراللہ مرقدہٗ کے یہاں سے اصول الشاشی کا اور دوسرا حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی حال شیخ الاسلام پاکستان جو اس وقت مظاہر علوم کے مدرس تھے علمِ الصیغہ منتقل ہوکر آیا اور دونوں کتابیں میری بے پڑھی تھیں۔ علم الصیغہ کا کچھ زیادہ فکر نہ ہوا، البتہ اصول الشاشی اہم تھی۔ جماعت بھی اس کی کچھ بڑی تھی۔ میں نے چچا جان نوراللہ مرقدہٗ سے پوچھا کہ سبق کہاں سے ہوگا؟ تو انہوں نے بتایا کہ فَصْل فِیْ الْاَمْر کے ایک ورق کے بعد سے ہے مگر میں نے اس لئے کہ مجھے طلباء کا اندازہ تھا کہ طالب علم دھوکہ دیا کرتے ہیں۔ چچا جان سے امر کی بحث دو ورق پڑھ لئے، ایک طلباء کا پڑھا ہوا اور دوسرا بے پڑھا، ان سے تو اپنے ہی ضابطے پر پڑھے کہ جلدی جلدی، لیکن چونکہ اعلان بدھ کو ہوگیا تھا اور شنبہ سے سبق شروع تھے، اس لئے دو تین دن میں کتب اصول میں اصول الشاشی کے شروح وحواشی، نورالانوار ومنار، اس کی شرح کشف الاسرار، حسامی اور اس کی جتنی شروح مل سکیں، توضیح تلویح، دو دن میں اَمر کی ابتدائی بحث سب میں نے خوب دیکھی اور درس گاہ میں پہنچنے کے بعد اجنبیانہ پوچھا، سبق کہاں سے ہے؟ سب نے متفق اللسان ہوکر کہا فَصْل فِیْ الْاَمْر سے۔ میں تو پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ دھوکہ دیں گے، میں نے ایک گھنٹہ امر کی بحث میں خرچ کر دیا۔ معلوم نہیں کیا کیا کہا ہوگا۔ اتنا یاد ہے کہ پہلا دن وَفَصْل فِیْ الْاَمْر پر خرچ ہوا تھا۔ اس کے بعد پورا ایک ہفتہ اس ایک ورق میں لگا جو چچا جان ایک دو دن میں پڑھا چکے تھے۔ مولوی ادریس صاحب کو اللہ جزائے خیر دے، ان ہی کی نصیحت اور تجربہ کا یہ ثمرہ تھا۔

ایک ہفتہ بعد میرے پاس اصول الشاشی کی جماعت نہایت مؤکد تحریری اور زبانی درخواست پہنچی کہ ”ہم اصول الشاشی تجھ سے اول سے پڑھنا چاہتے ہیں۔“ میں نے کہہ دیا ”مدرسہ کا سبق ہے میرا ذاتی سبق نہیں، مہتمم صاحب حکم دیں گے تو مجھے انکار نہیں۔“ چونکہ ایک بڑے مدرس کے یہاں سے منتقل ہوکر آئی تھی، اس لئے باضابطہ تحریری درخواست کی تو لوگوں نے ہمت نہیں کی، البتہ خصوصی لوگوں نے زبانی ان سے کہا، انہوں نے انکار کر دیا۔ البتہ یہ نفع ضرور ہوا کہ بعض اکابر مدرسین، نیز بعض طلباء، بعض منتظمین کو میرے امرد اور کم عمر اور حسین وجمیل ہونے کی وجہ سے مدرسی پر اعتراض تھا۔ مگر اکابر کی طرف سے چونکہ تجویز تھی اور علی الاعلان اعتراض کا اس زمانے میں دستور نہیں چلا تھا، بالخصوص بڑوں کی طرف سے، اس لئے مہتمم صاحب کو بھی کچھ سوجھ رہا تھا اس لئے اصول الشاشی کی جماعت کی اس درخواست نے مہتمم صاحب کو میری طرف سے مطمئن کر دیا۔ اللہ ان پڑھنے والوں کو بڑی جزائے خیر دے۔

میرا ابتدائی تقرر میرے حضرت قدس سرہٗ کی تجویز سے ص پر ہوا تھا۔ اعلیٰ حضرت

رائے پوری حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے فرمایا ''قرضہ بہت ہے، شادی بھی عنقریب ہونے والی ہے، کم سے کم تنخواہ ص ہونی چاہیے۔'' اس پر اصرار بھی فرمایا۔ مگر میرے حضرت نے فرمایا کہ ''مدرسہ کی روایت کے بھی یہ خلاف ہے، رعایت ہی رعایت ہے۔'' اس لئے کہ مولانا منظور احمد صاحبؒ سہارنپوری میرے سے پانچ برس پہلے کے مدرس تھے اور اس وقت تنخواہ ترقیات ہوکر ص تک پہنچتی تھی جو میرے تقرر کے ساتھ بھی میری وجہ سے ص ہوئی تھی۔ مولانا مرحوم کا ابتدائی تقرر شوال ۳۰ھ میں بلاتنخواہ معین مدرس کا ہوا تھا اور شوال ۳۲ھ سے دس روپے مشاہرہ پر تنخواہ دار ملازم ہوئے تھے اور پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے مدرس دوم تک پہنچے تھے اور ۳۲ھ جمادی الاول ۸۸ھ بوقت صبح انتقال فرما گئے اور حاجی شاہ میں مدفون ہوئے۔ نَوَّرَ اللّٰہ مرقدہٗ اَعْلَی اللّٰہ مرتبہٗ

مولانا ظفر احمد صاحب کے پاس بھی سبق اس وقت میزان منشعب سے شروع ہوکر قدوری تک پہنچے تھے۔ یہ دونوں چیزیں بھی معترضین اور حاسدین کے لئے موجب تکدر اور گرانی تھیں۔ خود مولانا منظور احمد صاحب کو بھی فطرتاً خیال تو ضرور ہونا چاہیے تھا مگر انہوں نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ البتہ مجھ سے یہ اصرار کیا کہ ''میں نے اصول الشاشی اب تک پڑھائی نہیں اور قدوری کئی دفعہ پڑھا چکا ہوں، اصول الشاشی تیری بے پڑھی ہے، قدوری تیری پڑھی ہوئی ہے، تجھے اس میں آسانی رہے گی۔'' میں نے مولانا مرحوم سے کہا کہ ''بالکل صحیح فرمایا، بہت آسانی رہے گی۔ اصول الشاشی میری پڑھی ہوئی بھی نہیں ہے، لیکن میں مہتمم صاحب سے کہوں کہ آپ کو بدل دیجئے یہ دشوار ہے، اس لئے کہ مہتمم صاحب شروع ہی میں نالائق فرمادیں گے، آپ اگر مہتمم صاحب سے درخواست کرکے تبادلہ کرلیں گے تو مجھے کوئی گرانی نہ ہوگی۔'' مرحوم کو اس کی ہمت اس لئے نہ ہوئی کہ حضرت قدس سرہٗ کے دور میں اخیر دور تک کسی مدرس کا خود سبق مانگنا انتہائی عیب سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز اس کے تکبّر کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ یہ اپنے کو بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ اس زمانے میں کسی مدرس کو کسی سبق کی خواہش ہوتی اور خواہش تو ہوتی ہی رہتی تھی، تو اس کا دستور یہ تھا کہ کوئی مدرس اپنے دوست کو اس پر آمادہ کرلیتا تھا کہ جب تقسیم اسباق کا وقت آئے اور کتاب کا نام لا جائے تو تُو میرے نام پر تجویز کرادینا۔ اس لئے مولانا منظور صاحب کی اور بھی ہمت نہ ہوئی کہ مہتمم صاحب سے کہیں اور ان کی بات حضرت کے یہاں پہنچ جائے۔

کُتب زیرِ تدریس زَکَرِیّا عُفِی عَنہ

ازمحرم ۳۵ھ تا شعبان ۳۵ھ

☆علم الصیغہ، ☆نحو الیمن ☆مائۃ عامل منظوم ☆مُنیۃ المصلی ☆شرح مائۃ ☆اصول الشاشی ☆خلاصہ نحومیر ☆قال اقول، تین سبق مستقل۔

ازشوال ۳۵ھ تا شعبان ۳۶ھ

☆مرقاۃ ☆قدوری ☆شرح تہذیب ☆کافیہ ☆نورالایضاح ☆اصول الشاشی ☆شرح جامی ☆بحث فعل، بحث اسم نصف پر منتقل ہوگئی ☆عجب العجاب ☆نحو الیمن۔

ازشوال ۳۶ھ تا شعبان ۳۷ھ

☆مقامات ☆سبعہ معلقہ ☆قطبی میر ☆کنز ☆قدوری ☆اصول الشاشی۔

ازشوال ۳۷ھ تا شعبان ۳۸ھ

ہدایہ اولین۔ حماسہ بعد عشاء۔ بذل کی وجہ سے بعض سبق خارج میں ہوا کرتے تھے۔ ایک سبق حضرت کی اشراق کی نماز تک اور ایک سبق عصر کی نماز کے بعد بھی اکثر پڑھانے کی نوبت آئی، شعبان ۳۸ھ میں حجاز چلا گیا، اور محرم ۳۹ھ میں واپسی ہوئی، اس زمانہ کے سبق یاد نہیں، لیکن ہدایہ اولین تین دفعہ پڑھانے کی نوبت آئی اور قطبی میر تو لَا تُعَدُّ وَلَا تُحصیٰ، شوال ۳۶ھ سے شعبان ۴۴ھ تک شاید ہی کوئی ایسا سال گزرا ہوگا جس میں قطبی تصدیقات اور میر قطبی میرے یہاں نہ ہوئی ہو۔ اکابر مدرسین منطق سے گھبراتے تھے، میر قطبی اور قطبی تصدیقات اور شرح تہذیب کی جماعت بھی اکثر میرے ہی یہاں رہتی تھی۔ شرح تہذیب کی جماعت بھی میر تک پہنچ جاتی تھی۔

اس زمانے کے مدرسین اتنی اعلیٰ تحقیق سے نہیں پڑھاتے تھے جیسا کہ اس زمانہ کے علماء کرام پڑھاتے تھے کہ کوئی کتاب اِلّا مَاشَاءَ اللہ نصاب تک نہیں پہنچتی۔ میں نے تین سال ''نورالانوار'' پڑھائی اور ہر سال ''نورالانوار'' کے بعد اس کی جگہ حُسامی ہوا کرتی تھی۔ بحث فعل کے بعد بحث اسم بھی اکثر تین ربع کے قریب ہوجاتی تھی۔ دورہ کے سبق

صرف تین گھنٹے ہوتے تھے۔ دو میں ترمذی، بخاری اور ایک میں ابوداؤد، پھر مسلم پھر نسائی۔ اور دورہ کے اسباق میں ایک سبق بیضاوی شریف کا تھا، اس کے بعد مَدَارِک۔ اس کے بعد کشاف۔ ایک گھنٹہ ہدایہ اخیرین کا تھا، اس کے بعد درمختار۔ ایک گھنٹہ توضیح تلویح کا تھا۔ اس کے بعد مسلم الثبوت۔ اس کے بعد کوئی تیسری کتاب بھی اکثر ہو جاتی تھی۔ سب سے پہلے دورہ میں سے توضیح نکلی تھی اور اس کا گھنٹہ مسلم شریف کو دیا گیا تھا۔ پھر ہدایہ نکلا۔ پھر بیضاوی نکلی۔ اب ماشاء اللہ چھ گھنٹے دورہ شریف کو دیئے جا رہے ہیں پھر بھی حضرات محققین عظام رات کو اور جمعہ کو پڑھاتے ہیں پھر بھی مشکل سے دورہ پورا ہوتا ہے۔ اور اب تو محققین عظام جلالین و ہدایہ وغیرہ بھی ماشاء اللہ رات کو پڑھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تحقیقات میں اور اضافہ فرمادیں۔

میری طالب علمی اور ابتدائی مدرسی میں ۴۶ھ تک بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ حضرت قدس سرہٗ کے دور میں رات کو پڑھانا مدرس کی نالائقی سمجھا جاتا تھا کہ کتاب پڑھانے پر قادر نہیں تو بالکل صحیح ہے۔

از شوال ۴۰ھ تا شعبان ۴۱ھ

رجب ۴۱ھ سے بخاری کے تین پارے ناظم صاحب کے یہاں سے منتقل ہو کر آئے۔

از شوال ۴۱ھ تا شعبان ۴۲ھ

مشکوٰۃ شریف ۱

از شوال ۴۲ھ تا شعبان ۴۳ھ

مشکوٰۃ شریف ۲

از شوال ۴۳ھ تا شعبان ۴۴ھ

مشکوٰۃ شریف ۳

از شوال ۴۴ھ تا صفر ۴۶ھ

شوال ۴۴ھ میں سفر حجاز کو روانگی ۴۵ھ میں مدینہ طیبہ کا قیام، اور وہاں

درسِ شرعیہ میں مغربی طلباء کو ابوداؤد شریف اور الحاج عبدالحمید کو مقامات عربی زبان میں پڑھائی اور بعض کتب کی تالیف، جو نقشہ تالیفات میں آرہی ہیں۔

از ۱۸ صفر ۴۶ھ تا شعبان ۸۸ھ

یہ ناکارہ ۱۸ صفر ۴۶ھ کو حجاز کے طویل سفر سے واپس پہنچا۔ ۱۸ صفر ۴۶ھ کو ابوداؤد صفحہ ۸۰ سے ناظم صاحب سے منتقل ہو کر آئی۔ اس کے ساتھ ہی نسائی شریف شروع ہوئی۔ اس کے بعد مؤطا امام محمد، بخاری از جزء ۱۲ چار پارے، اسکے بعد سے ابوداؤد شریف تو مستقل ۷۵ھ تک اس ناکارہ کا سبق رہا۔ بخاری شریف کے متعلق حضرات سرپرستان نے ۷۱ھ میں یہ تجویز کر دیا تھا کہ ترمذی صدر مدرس مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے پاس ہو اور بخاری شریف زکریا کے پاس، اس لئے کہ حضرت ناظم صاحب کے پاس انتظامی کام بہت بڑھ گئے تھے۔ مگر ناظم صاحب کو اس پر بہت زیادہ تأثر قلق اور گرانی تھی۔ اور ہونی بھی چاہیے تھی۔ اس لئے زکریا نے سرپرستان کی اجازت سے یہ طے کر دیا کہ ترمذی تو مستقل صدر مدرس کے پاس رہے اور بخاری شریف کا افتتاح ناظم صاحب کرا دیا کریں اور بقرعید کے بعد وہ زکریا کے پاس منتقل ہو جایا کرے اور جلد ثانی ناظم صاحب بعد مغرب پڑھا دیا کریں۔

۷۳ھ میں ناظم صاحبؒ کا رنگون کا سفر ہوا، اس سال ابوداؤد کے ساتھ بخاری کی دونوں جلدیں بھی زکریا کے پاس ہوئیں۔

۷۴ھ میں بھی ناظم صاحب کی مسلسل علالت کی وجہ سے دونوں جلدیں مع ابوداؤد کے زکریا کے پاس ہوئیں۔ ناظم صاحب کے انتقال کے بعد سے ابوداؤد مولانا اسعد اللہ صاحب کی طرف منتقل ہو کر بخاری شریف کی دونوں جلدیں زکریا کے پاس رہیں۔ تا شعبان ۸۸ھ۔

صفر ۴۶ھ کے بعد سے چونکہ زکریا کے اوقات زیادہ فارغ تھے، اس لئے دورہ کے درسین میں سے علالت یا طویل سفر کی وجہ سے جس کا سبق منتقل ہوتا ترمذی، مسلم وغیرہ زکریا کے پاس منتقل ہوا کرتا تھا۔ شمائل تو کئی سال مسلسل رہی، جس کی تفصیل میں تطویل سے کام لیا، تقسیم اسباق میں تفاصیل موجود ہیں۔ مسلسلات کی ابتداء میں تو خصوصی احباب وقتاً اجازت لیتے رہتے تھے، لیکن ۵۳ھ سے باضابطہ زکریا کے سبق ختم ہونے کے بعد ہونے لگی، جو ۸۸ھ تک رہی۔

۸۹ھ میں زکریا کا قیام حجاز میں رہا۔ اس لئے بخاری شریف مولانا یونس صاحب

کی طرف منتقل ہوئی، اس لئے مسلسلات بھی انہی کے پاس ہوئی۔ ۲۳ رجب ۹۰ھ کو مسلسلات کا شور ہو گیا اور تقریباً ڈیڑھ ہزار کا مجمع ہو گیا، جس میں اکابر و خواص بھی بہت جمع ہو گئے تھے۔

ان خانوں میں کتابوں کا استیعاب نہیں۔ دو چار اہم کتابوں کی یادداشتیں ہیں، قطبی میر تو ہر سال دو تین دفعہ ہو جاتی تھی، اس لئے کہ منطق سے سب ہی گھبراتے تھے۔ چھوٹا مدرس میں ہی تھا، قطبی میر تو ہوتی ہی تھی۔ تہذیب اور شرح تہذیب کی جماعت بھی میرے یہاں قطبی تک پہنچ جاتی تھی۔ نور الانوار اور اس کے بعد حسامی تین سال مسلسل ہوئی۔ سالوں کی تعیین صحیح اندارج میں نہ ملی۔ اس زمانے کا نقشہ موجود تو ہے مگر اس وقت ملا نہیں، ممکن ہے بعد میں کسی کو ملے تو اضافہ ہو جائے۔

شوال ۳۶ھ میں ایک اہم واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ اوپر لکھ چکا ہوں، حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں کسی مدرس کی یہ ہمت نہ پڑی تھی کہ اپنے لئے کوئی کتاب مانگے۔ حضرت قدس سرہٗ کی موجودگی میں مہتمم صاحب اسباق کا نقشہ اور مدرسین کا نقشہ لے کر بیٹھتے تھے، کتاب کا نام پکارا جاتا اور اکابر مدرسین میں سے کوئی شخص کسی مدرس کا نام تجویز کر دیتا، اگر کسی دوسرے مدرس کی طرف سے کوئی جرح نہ ہوتی تو حضرت کی منظوری پر اس کے نام لکھ دی جاتی۔ اکابر مدرسین میں سے اگر کسی کی طرف سے جرح ہوتی، مثلاً اونچی معلوم ہوتی یا اس سے نیچے کتاب ابھی نہیں پڑھائی، یا پوچھ لیجئے آپ کو اس کتاب کے پڑھانے میں کوئی اشکال تو نہ ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔ تو پھر دوسرے مدرسین کی تائید کے ساتھ یا نکیر کے ساتھ حضرت قدس سرہٗ کا فیصلہ ناطق ہوتا۔

یہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ کوئی مدرس اپنے لئے کوئی کتاب نہیں مانگ سکتا تھا، البتہ جو کتاب کوئی مدرس کئی دفعہ پڑھا چکا ہو اس کے مانگنے میں کوئی تردد نہیں ہوتا تھا۔

کوئی مدرس نئی کتاب مانگنا چاہتا تھا تو آپس کے مدرسین میں یہ طے ہو جاتا تھا کہ جب فلاں کتاب کا نام آئے تو اس کے نام تجویز کرا دی جائے۔

مجھے ادب سے کچھ شوق بھی تھا اور والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے پڑھایا بھی کچھ محنت سے تھا، شوال ۳۶ھ میں میں نے مہتمم صاحب سے عرض کیا ''اگر نامناسب نہ ہو تو مقامات تقسیم اسباق کے وقت میں میرے لئے تجویز فرما دیں۔'' مہتمم صاحب نے بہت ہی شفقت سے یہ فرمایا کہ ''ایک ہی سال تیری مدرسی کا ہوا ہے، ابھی تقاضا ہی کیا ہے؟ انشاء

اللہ مقامات بھی پڑھائے گا اور حدیث بھی پڑھائے گا، جلدی نہ کر، ابھی ہرگز مناسب نہیں۔'' میرا خیال تھا کہ اگر مہتمم صاحب نیم راضی ہوں تو پھر کسی مدرس سے، چچا جان یا مولانا ظفر احمد سے کہوں کہ وہ مقامات میرے نام کرادیں۔ اس لئے کہ زیادہ جرح مہتمم صاحب یا مولانا ثابت علی صاحب مرحوم کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں ادب کی سب کتابیں پہلے گھنٹے میں ہوتی تھیں، اور اس گھنٹے میں جلالین شریف، مختصر المعانی، شرح جامی بحث اسم بھی ہوتی تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب کے یہاں امسال جلالین ان کے بڑے شوق پر میرے چچا جان نے تجویز کرائی تھی اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں ان کی خواہش سے مختصر المعانی آئی تھی۔

سبعہ معلقہ کا سبق

جب ادب کی کتابوں کا نمبر شروع ہوا تو متنبّی کا نام بولا گیا اور وہ مولانا ثابت علی صاحب کے یہاں لکھی گئی تھی، اس لئے کہ ادب کے سبق اس زمانے میں تین ہی مدرسوں کے یہاں ہوا کرتے تھے۔ مولانا ثابت علی صاحبؒ، مولانا ظفر احمد صاحبؒ اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ متنبّی کے بعد سبعہ معلقہ کا نام بولا گیا۔ ادب کی کتابیں آدھ گھنٹہ بھی ہوجاتی تھیں، اس کے علاوہ دوسری کتابیں ایک گھنٹہ ہوتی تھیں یا دو گھنٹے۔ جب متنبّی کے بعد سبعہ معلقہ کا نام لیا گیا، ادب کے تینوں مدرسین کا گھنٹہ پر ہو چکا تھا اور مولانا ظفر احمد صاحب اور چچا جان اپنی اپنی کتاب بدلنا پسند نہیں کرتے تھے کہ پہلی دفعہ ہو رہی تھی، اور جب ان سے کہا گیا کہ اپنی اپنی کتابیں بدل لو تو انہوں نے عرض کیا کہ پہلی پہلی دفعہ آئی ہیں، اور ادب کی کتابیں یہ حضرات کئی دفعہ پڑھا چکے تھے۔ مہتمم صاحب نے مولانا ثابت علی صاحب پر اصرار کیا کہ متنبّی اور سبعہ معلقہ آدھا آدھا گھنٹہ پڑھادیں مولانا ثابت علی صاحب نے ذرا شدت سے انکار کیا، جلدی بولنے کے مولانا بہت عادی تھے، فرمایا پہلے گھنٹہ میں آدھ گھنٹہ مشکل ہے، پہلے گھنٹہ میں آدھ گھنٹہ مشکل ہے،'' یہ لفظ دو دفعہ دہرایا، اور فرمایا کہ ''چائے بھی تو پینی ہوتی ہے۔'' مولانا مرحوم اپنی چائے خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے اور چائے تیز ہوتی تھی۔ تین چار منٹ سکوت اور ردوقدح میں گزرے۔ مولانا عبداللطیف صاحب نے زکریا کا نام پیش کردیا۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے بڑے زور سے تائید کی ''ضرور، بہت اچھی پڑھائے گا۔'' میرے چچا جان نے بھی فرمایا کہ ''اچھی پڑھائے گا۔'' اس میں اگر مخالفت کرتے تو مولانا ثابت علی صاحب کرتے، مگر وہ بھی متنبّی کی وجہ سے دبے ہوئے تھے۔ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا ''کہہ دو'' پھر کیا تھا، مجھے وہ منظر ہمیشہ یاد رہے گا اور بڑا لطف آتا ہے۔

مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مہتمم صاحب کے ہاتھ میں قلم اور نقشے پر جھکے ہوئے، اور بہت دبی ہوئی آواز سے فرمایا، ''میں نے تو مقامات کو بھی انکار کر دیا تھا۔'' مِن مِن تو سب نے سنی مگر مطلب میں ہی سمجھا۔ اس کے بعد مقامات کا نام لیا گیا، اب تو میری بھی زبان روز سے کھل گئی، میں نے عرض کیا ''میں تو دونوں کتابیں آدھے گھنٹے میں پڑھا دوں گا، بلکہ حضرت مہتمم صاحب اگر اعلان فرمادیں تو مقامات کا سبق آدھ گھنٹہ پہلے ہی شروع ہو جائے گا تو دونوں سبق پون پون گھنٹہ ہو سکتے ہیں۔ مجھے چائے پینی نہیں نہ میں چائے پیتا ہوں۔'' وہ بھی میرے نام لکھی گئی۔ مقامات پر تو کوئی شور شغب نہ ہوا، اس لئے کہ یہ جماعت مشکوٰۃ کی جماعت تھی لیکن سبعہ معلقہ کی جماعت دورے کے بعد کی جماعت تھی اور یہ وہ لوگ تھے جو گزشتہ سال دورے میں میرے ایک ساتھی بھی رہ چکے تھے، اسلئے معلقہ کی جماعت نے بہت زور وشور ابتداء میرے خلاف اسی طرح کیا کہ حضرت قدس سرہٗ تک نہیں پہنچا، البتہ مہتمم صاحب تک بڑی بڑی شکایات پہنچتی تھیں۔ اس زمانے میں مدرسہ کا قانون یہ تھا کہ مدرس ہر کتاب کو جس کو پڑھائے تو دو نسخے ایک مطبع کے بھی لے سکتا تھا، ایک گھر پر مطالعہ کے لئے، ایک درس گاہ میں پڑھانے کے لئے، اور مختلف مطابع کی تو ہر کتاب کا ایک نسخہ مختلف حواشی کی وجہ سے بھی لے سکتا تھا۔ اس سیہ کار نے ایک تو مکاری یہ کی کہ کوئی نسخہ معلقہ کا مدرسہ سے نہیں لیا اور شرحیں بھی اپنے نام پر کوئی نہیں لی، ایک آدھ مولانا ظفر احمد صاحب سے کہہ کر ان کے نام پر لی، ایک چچا جان کے نام پر، اور معلقہ کے چند نسخے مختلف مطابع کے میرے تجارتی کتب خانے میں بھی موجود تھے۔ جو لوگ میرے مخالف تھے اور وہ ابتدائی مدرسین بھی جن کو میرے معلقہ پر رشک وحسد فطری چیز تھی، انہوں نے ان طلباء کی بہت مدد کی، اور جو لوگ معلقہ پڑھ چکے تھے ان کو بھی پڑھا کر میرے سبق میں مجھے دق کرنے کے واسطے بھیجا کرتے تھے، مگر اللہ کے انعامات کا نہ یہ سیہ کار شمار کر سکتا ہے نہ شکر ادا کر سکتا ہے، جو لوگ مجھے دِق کرنے کے واسطے معاند بن کر معلقہ میں شریک ہوا کرتے تھے ان کی درخواستیں معلقہ میں داخلہ کی مہتمم صاحب کے پاس دمادم پہنچنی شروع ہوئیں۔

ایک صاحب نے جو میرے والد صاحبؒ کے بھی مخالفین میں سے تھے، مہتمم صاحب سے کہا کہ ''معلقہ والے بہت رو رہے ہیں ان کا ناس تو مار دیا، ان کو حضرت مولانا ذوالفقار صاحب کی اردو شرح ''التعلیقات علی السبع المعلقات مدرسہ سے دے دو کہ ان کو کچھ تو پتہ چلے۔'' مہتمم صاحب نے فرمایا کہ اردو شرح ادب کی کتاب کی ملنے کی ممانعت ہے، مگر ان صاحب نے بہت زور دیا کہ ''معلقہ والے بہت رو رہے ہیں۔'' مہتمم صاحب نے فرمایا کہ

میرے پاس تو معلقہ میں داخل ہونے کی درخواستیں آرہی ہیں، تم کیوں رو رہے ہیں؟'' لیکن ان کے شدید اصرار پر مہتمم صاحب نے ایک تحریر میرے پاس بھیجی کہ ''معلقہ کے طلباء تعلیقات مانگتے ہیں، تیری کیا رائے ہے؟'' میں نے اس پر لکھ دیا کہ ''میرا کوئی حرج نہیں، بڑے شوق سے دے دیں لیکن طلباء کے لئے اردو ترجمہ مضر سمجھتا ہوں۔'' مولانا ادریس صاحب کی نصیحت نے یہاں بھی مجھے بہت کام دیا اور اس دن سے میں تعلیقات کو خاص طور سے دیکھ کر جاتا تھا، اور کبھی کبھی اپنی حماقت سے یہ لفظ بھی کہہ دیتا تھا کہ ''تم میں سے کسی کے پاس تعلیقات ہو تو دیکھ لینا، مولانا نے یہ مطلب تحریر فرمایا مگر میرے نزدیک یہ مطلب زیادہ اچھا ہے۔'' اس پر اور بھی طلباء میں شوق وذوق پیدا ہوا، اور معلقہ کی شرکت کی درخواستیں بھی بڑھ گئیں تو آخر میں ناظم کتب خانہ نے لکھا کہ ''معلقہ کا کوئی نسخہ کتب خانہ میں نہیں ہے، مزید خریدنے کی اجازت دی جائے، اس پر حضرت مہتمم صاحبؒ نے کتب خانے سے دریافت کیا کہ ''زکریا کے پاس کتنے نسخے ہیں؟'' کتب خانے نے جواب دیا کہ اس کے پاس نہ کوئی متن ہے اور نہ کوئی شرح۔ مہتمم صاحبؒ نے اس قاصد سے وہی اصل کتاب کی درخواست لانے والا تھا، دریافت فرمایا کہ وہ اپنی کتاب میں پڑھاتا ہے؟ طالب علم نے جواب دیا کہ اس کے پاس تو کوئی کتاب نہیں ہوتی، اشعار حفظ پڑھتا ہے اور حفظ ہی ترجمہ اور مطلب سب کچھ کہتا ہے۔'' لڑکپن تھا، زمانہ جاہلیت تھا، سبعہ معلقہ کے سارے ہی اشعار عشقیہ مضامین کے تھے، بالخصوص امروٴالقیس کا قصیدہ خوب یاد تھا۔ حضرت مہتمم صاحبؒ نے میرے حضرت قدس سرہٗ کے یہاں درخواست لکھی کہ ''سبعہ معلقہ کتب خانہ میں ختم ہوگئی جماعت بڑھ رہی ہے، مزید خریداری کی اجازت دی جائے۔'' میرا اندازہ یہ ہے جو اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میرے حضرت قدس سرہٗ کو بھی مہتمم صاحبؒ کی اس تحریر سے بڑی مسرت ہوئی، حضرت قدس سرہٗ نے لکھوا دیا کہ ''دس نسخے فوراً خرید لئے جائیں۔'' دوسری صبح کو میں اپنے مکان سے دارالطلبہ سبق پڑھانے کے لئے جارہا تھا اور مہتمم صاحبؒ کھالے پار کی طرف سے مدرسہ تشریف لارہے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے اور بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، مرحوم کا مکان قاضی کے محلے میں تھا لیکن نوراللہ مرقدہٗ کا دستور یہ تھا کہ گھر سے چلتے وقت ایک دن غربی نالے سے آتے اور ایک دن شہر کے بیچ بازار سے آتے اور ایک دن مشرقی نالہ کھالہ پار کی طرف سے آتے اور ان کے گھر سے مدرسہ تک تینوں سڑکوں پر جن جن چندہ دینے والوں کے گھر پڑتے، چاہے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہوتے، ان کے گھر جاکر بہت خوشامدانہ لہجے میں کہتے، ''بھائی تمہارا چندہ نہیں آیا، وہ بہت شرمندہ ہوکر یا تو اسی وقت پیش کرتا یا تھوڑی دیر بعد خود لے کر مدرسہ آتا۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، وہ مہتمم مدرسہ بھی تھے، مفتی مدرسہ بھی وہی تھے کہ ان کے زمانہ میں کوئی مستقل مفتی اخیر زمانہ کے علاوہ نہیں تھے، خصوصی محصلِ چندہ شہر بھی وہی تھے کہ محصلِ شہر تو ایک اور صاحب تھے، لیکن جب وہ یہ کہتے کہ ''فلاں کے یہاں گیا تھا اس نے چندہ نہیں دیا'' تو مہتمم صاحب خود اس کے گھر جا کر تقاضا فرماتے جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ اور مقدمات کی عدالتی کاروائی میں بھی خود جایا کرتے، کوئی ناظم اوقاف علیحدہ نہیں تھے جو عدالتی کام کرتا۔ اللہ بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، جب میں مقابلہ سے سلام کرتے ہوئے آگے گزرا تو یہ منظر بھی ہمیشہ یاد رہے گا کہ حضرت مہتمم صاحبؒ نے تسبیح جو ان کے ہاتھ میں تھی وہ پڑھتے ہوئے آرہے تھے، میرے مونڈھے پر ماری اور فرمایا کہ ''تیرے سبعہ معلقہ نے تو میری آنکھ نیچی کردی، میں نے تو مقامات کو بھی انکار کر دیا تھا، بھائی معاف کر دیجئے۔'' مجھے بھی بہت ندامت ہوئی اور اب بھی جب یہ قصہ یاد آتا ہے تو مہتمم صاحبؒ کی تواضع پر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔ میں نے عرض کیا، حضرت اس میں معافی کی کوئی بات نہیں۔ جناب کا ارشاد ابتدائی مدرس ہونے کے لحاظ سے بالکل مناسب تھا۔'' میں نے عرض کیا کہ معلقہ بالخصوص امرؤالقیس کا قصیدہ پڑنے کے زمانے ہی سے یاد تھا اور یہ واقعہ تھا کہ مجھے معلقہ جتنا یاد تھا مقامات اتنی یاد نہیں تھی ،اور اس معلقہ کے ہنگامے نے ؎

خدا شرّے برانگیزد ، دروخیرے نہاں باشد

میری ادب دانی کو اتنی شہرت دی کہ مولانا بدرالحسن صاحب کا جو قصہ علی میاں نے مولانا یوسف صاحبؒ کی سوانح کے صفحہ ۹۱ پر لکھا ہے وہ اسی کا ثمر تھا وہ بہت مختصر لکھا گیا ہے۔

مولانا بدرالحسن صاحب، جو اس زمانے میں لکھنو میں سب جج تھے کاندھلہ تشریف لے جاتے وقت سہارنپور آئے کہ راستہ ادھر سے بھی ہے، سہارنپور میں ان کا قیام خواجہ مظاہر حسن مرحوم کے مکان پر ہوا کرتا تھا۔ وہاں قیام فرمایا اور دن کا زیادہ حصہ حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں اور میری تعزیت میں مدرسہ میں گزرتا، انہوں نے نہایت خفیہ میری تحقیقات خوب کیں، اللہ جزائے خیر دے، اور جب ہر شخص کی زبان سے میری ادب دانی سنی تو مرحوم کو بہت مسرت ہوئی اور مجھ سے ازراہِ شفقت فرمایا کہ ''تیرے ادب کی بڑی تعریف سنی ہے، تیرے لئے مولوی فاضل کا امتحان دینا بہت آسان ہے، جلد از جلد امتحان کا فارم بھیج دے، اس میں تیری کامیابی یقینی ہے، اس کے بعد میں تجھے اپنے ساتھ لکھنو لے جاؤں گا اور چند مہینے انگریزی پڑھا کر زبان کا امتحان بی اے کا دلوادوں گا، اس کے بعد علی

گڑھ کالج کے ناظم دینیات کی ملازمت جو صرف میری ایک تحریر پر مل سکتی ہے، تین سو روپے تنخواہ ہے تجھے مل جائے گی۔'' میں نے معذرت کردی۔ وہ خاندان میں بڑے شمار ہوتے تھے، ان کے سامنے سب اہلِ خاندان ادب کی وجہ سے چپ رہتے تھے، بہت کم گو تھے، میں نے بہت ادب سے معذرت کردی کہ سہارنپور چھوڑنے کا تو ارادہ نہیں ہے، انہیں گراں ہوا، فرمایا: ''بے وقوف ہے۔'' ایک آدھ لفظ اور بھی کہا، مگر میں ساکت رہا۔ انہوں نے اگلے دن کاندھلہ جاکر میرے والد کے حقیقی ماموں اور میری اہلیہ مرحومہ کے حقیقی تایا مولانا شمس الحسن صاحبؒ کو جو خاندان میں نہایت غصیارے مشہور معروف تھے اور ان کے سامنے بھی خاندان کے بڑوں کی ان کے غصہ کی وجہ سے بولنے کی ہمت کم ہوتی تھی، مجھے سمجھانے کو بھیجا، مرحوم کو حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے مجھ پر شفقت تھی اس لئے وہ حضرت قدس سرہٗ سے بیعت ہو چکے تھے۔ مرحوم کی عادت یہ تھی کہ جس بات کو وہ بہت اہتمام سے کہنا چاہا کرتے تھے تو ابتداء کلام اس طرح ہوا کرتی تھی، ''اے کہے تو ایک بات کہہ دوں۔'' اس سے اہمیت مقصود ہوتی تھی اور اس جملہ کو دو دفعہ کہا کرتے تھے۔ وہ عصر کے وقت تشریف لائے، میرے یہاں چائے کا دور چل رہا تھا۔ فرمایا کہ ''تیرے پاس آیا کہوں۔'' میں سمجھ گیا۔ مرحوم میرے باپ کے حقیقی ماموں اور اہلیہ مرحومہ کے حقیقی تایا تھے۔ میں نے چائے پیش کی اور عرض کیا کہ اب تو وقت بہت قریب ہو گیا، وقت تھوڑا ہی ہے، مغرب کی نماز پڑھتے ہی حاضر ہو جاؤں گا۔ نماز پڑھتے ہی میں ان کو لے کر زنانہ مکان کی چھت پر چلا گیا۔ سردی کا موسم تھا، مغرب سے لے کر عشاء کی اذان ہو گئی، وہ مجھے سمجھاتے رہے اور میرے لڑکپن پر بعض مرتبہ چہرے پر غصہ بھی آجاتا تھا۔ ان کے ارشاد کا خلاصہ یہ تھا کہ شادی ہو چکی ہے، گھر ولادت بھی قریب تھی، سب سے بڑی بچی اہلیہ مولوی یوسف مرحوم کی ولادت کا زمانہ قریب تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمیشرہ کی شادی بھی کرنی ہے، آٹھ ہزار قرضہ بھی ہے، پندرہ روپے تنخواہ میں کیا کیا کرے گا؟

میرے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ ''یہ تو ہمیشہ سنا اور پڑھا ہے، جناب کو اس سے بھی واقفیت ہوگا کہ مقدر میں جو ہے وہ تو مل کر رہے گا، اور جو مقدر میں نہیں ہے وہ کہیں نہیں مل سکتا۔ میں جس ماحول میں ہوں اس میں اگر اپنی گندگیوں سے محفوظ رہوں یہ بھی اللہ کا احسان ہوگا، اس کم عمری میں عنفوان شباب میں علی گڑھ کے ماحول میں میرا محفوظ رہنا بہت مشکل ہے، وہ فرماتے تھے دنیا دارالاسباب ہے اسباب کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے، محض توکل پر نہیں رہا جاسکتا۔'' میں نے عرض کیا، بالکل صحیح فرمایا، ذرا اس میں تامل نہیں لیکن

اسباب کے درجے میں دو سبب موجود ہیں، ایک مدرسہ کی ملازمت، جو یقیناً محدود ہے، دوسرے کتابوں کی تجارت جس میں اللہ جل شانہٗ جتنا بھی عطا فرمائے، کوئی تحدید نہیں۔'' عشاء کی اذان پر میرے مخدوم ومکرم میرے والد صاحب کے ماموںؒ نے یوں فرمایا ''اے تو کہہ دوں؟'' میں نے کہا ''ضرور'' تو نے جو کچھ کہا، اگر دل سے ہو تو تیرا منہ چوم لینے کے قابل ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ تو نے سب کچھ زبان زوری سے کہا ہے، میں نے عرض کیا ''دعا فرمائیں کہ اللہ جل شانہٗ اس کو دل سے بھی کر دے۔'' وہ بھی تشریف لے گئے۔

میرے بعض معاصر عزیزوں کو جن کا نام لکھنا نہیں چاہتا، میری یہ حرکت اس قدر ناگوار ہوئی کہ چند ماہ بعد جب کاندھلہ گیا تو میرے بڑوں نے تو کوئی تعرض نہ کیا، مگر میرے معاصرین نے بہت ہی طعن وتشنیع سب وشتم کیا۔ اور ایک عزیز مرحوم نے تو سب سے زیادہ غصے کا اظہار کیا، حتیٰ کہ چند معاصرین اعزّاء کسی مجلس میں بیٹھے ہوتے تو وہ مرحوم خفا ہو کر یہ کہہ کر اٹھ جاتا کہ میں ایسے کمینے لوگوں کے پاس بیٹھنا گوارا نہیں کرتا، جو صدقے وزکوٰۃ کی روٹیوں کو عزت کی تنخواہ پر ترجیح دیتے ہوں۔'' اور مرحوم خوب خفا ہوا لیکن اللہ جل شانہ کا اس سیہ کار کے ساتھ ایک خاص معاملہ ہمیشہ رہا کہ جو ابتداء میں بہت زور سے خفا ہوئے وہ انتہا میں اتنے ہی زیادہ محبت، عقیدت اور اگر یوں کہوں کہ عشق میں مبتلا ہوئے تو غلط نہیں۔ مرحوم اخیر زمانے میں کئی سال بیمار رہا، اللہ بہت ہی مغفرت کرے، مجھے بار بار بلانے کے تار بھی دیتا، میرا بار بار جانا تو بہت مشکل تھا، کبھی کبھی چلا جاتا۔ وہ مرحوم اکثر یہاں آتا، کئی کئی دن رہتا اور اس کا اصرار یہ تھا کہ ''میرے سینے پر ہاتھ رکھ، اس سے سکون ہوتا ہے۔''

تقسیم جائیداد میں بڈھانہ کا سفر

اس علی گڑھ والے قصہ کے چند سال بعد ایک واقعہ منجانب اللہ پیش آیا۔ ہمارے یہاں جدّی جائداد نہ معلوم کئی پشتوں سے مشترک چلی آرہی تھی، ایک دفعہ کاندھلوی اعزاء کا جرنیلی حکم پہنچا: ''تقسیم جائیداد میں تحصیل بڈھانہ میں سب افراد کو جانا ہے، سب کی شرکت نہایت ضروری ہے۔'' میں نے اول تو بڑی معذرت کی کہ وکالت نامہ جس کے نام کہو لکھ کر بھیج دوں۔'' مگر معلوم ہوا اور سارے ہی خاندان کا اصرار ہوا کہ بڈھانہ جانا بہت ضروری ہے۔ ایک شخص کے نہ ہونے سے سب کا معاملہ گڑبڑ میں پڑ جائے گا۔ یا مجبوری جانا پڑا۔ بڈھانہ کے تحصیل دار صاحب، جناب الحاج احمد حسن صاحب گنگوہیؒ جن کی ''مناجات احمد حسن'' مشہور ومعروف ہے، کے پوتے تھے، وہ صورت شناس تو نہ تھے مگر گنگوہ کی وجہ سے میرے والد صاحب اور میرے نام سے خوب واقف تھے کاندھلوی رؤسا سے ان کے

تعلقات تھے، بڑی دعوتیں اور ڈالیاں ان کی خدمت میں پہنچا کرتی تھیں۔ اس لئے کہ روز کے مقدمات ان حضرات کے رہتے تھے، اور باوجود اس کے جیسا مقدمات میں ہوا کرتا ہے، بعض مقدمات میں کئی کئی دن لگ جاتے۔ تجویزیں یہ ہو رہی تھیں کہ معلوم نہیں کے دن بڈھانہ میں ٹھہرنا پڑے گا، میں تو بڈھانہ سے بالکل ناواقف تھا، ان حضرات کی روز کی آمد و رفت تھی، اور آپس میں اختلاف رائے ہو رہا تھا کہ کس کے مکان پر ٹھہرا جائے؟ ہر شخص اپنے تعلق والے کو ترجیح دیتا تھا۔

علی الصباح کاندھلہ سے بہت سا کھانا وانا نہایت لذیز، مرغن روٹیاں اور مرغے ساتھ تھے، کاندھلہ سے چل کر دس بجے کے قریب بڈھانہ پہنچے، تجویز یہ ٹھہری کہ پہلے سیدھے تحصیل میں چلیں۔ سامان کھانا وغیرہ سب ان بہلیوں میں چھوڑ دیا جوان حضرات کی تھیں۔ ۲۵، ۳۰ آدمیوں کا مجمع سب روسا آگے آگے اور یہ ناکارہ کسمپرسی کی حالت میں پیچھے پیچھے، پیشکار صاحب نے دور سے مجھے دیکھا اور ایک دم اپنی کرسی سے اٹھ کر اور پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی کرسی پر بیٹھنے کا اصرار کیا، میں نے شدت سے انکار کیا کہ میرے اعزاء ان میں بعض میرے اکابر بھی ہیں کھڑے ہیں اور میں بیٹھ جاؤں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ مگر پیشکار صاحب ہرگز نہ مانے اور زبردستی مجھے بٹھا دیا۔ یہ میرے سارے اعزاء نہایت سوچ میں پڑ گئے کہ کھلایا تو ساری عمر ہم نے، یہ کیا ہو رہا ہے؟ ان کی زبردستی پر میں بیٹھ گیا اور انہوں نے کاغذات لے کر تحصیلدار صاحب سے کہا کہ حضور! سب سے پہلے ان کا کام ہوگا۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو انہوں نے میرے والد صاحبؒ کا نام لے کر کہا کہ ان کے صاحبزادے ہیں، مظاہر علوم میں مدرس ہیں۔ تحصیلدار صاحب نے کہا کہ اچھا اچھا، ان سے تو میں واقف ہوں۔ مگر میں بہت سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ یہ کہاں سے واقف ہیں۔ اللہ تعالیٰ پیشکار صاحب اور تحصیلدار صاحب کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، اگر زندہ ہوں تو ترقیات عطا فرمائے اور عالم بقاء میں جا چکے ہوں تو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے۔ تحصیلدار صاحب نے فوراً کاغذات لے کر گھنٹہ پون گھنٹہ تک بہت غور سے ان کو پڑھا، میں بیٹھا رہا اور یہ سب کھڑے رہے، ایک دو صاحب بینچ پر بیٹھ گئے اور تحصیلدار صاحب نے گھنٹہ پون گھنٹہ میں سب نمٹا کر دستخط کر کے کاغذات پیشکار کے حوالے کر دیئے، میرے سب اعزاء کو حیرت ہو رہی تھی اور سب سے زیادہ مجھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

وہاں سے واپسی پر پیشکار صاحب میری مشایعت کو آئے اور تحصیل کے دروازے پر انہوں نے اپنی جیب سے بیس روپے نکال کر دونوں ہاتھوں سے مجھے پیش

کئے میں نے بہت شدت سے انکار کیا، آپ کا تو یہی بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے ہمیں جلد فارغ کر دیا، ہم تو سوچ رہے تھے کہ رات کہاں ٹھہریں گے۔ میرے اعزاء نے میری تائید کی کہ پیشکار صاحب اس کی ضرورت نہیں، آپ نے تو بڑا احسان کیا، ہم سب کو جلدی نمٹا دیا، مگر وہ بہت اصرار کرتے رہے، میرے شدید انکار پر انہوں نے یہ روپے جیب میں ڈال کر یہ کہا کہ ''یہ دو تین برس ہوئے میں نے آپ سے سہارنپور میں قرض لئے تھے، آپ نے مجھے پہچانا نہیں، میں فلانا ہوں۔'' ان کے تعارف پر مجھے یاد آیا کہ وہ مظاہر علوم کے کتب خانے میں ملازم رہ چکے ہیں اور اس زمانے میں مجھ سے قرض لیا تھا۔ ان کے اس کہنے پر میں نے کہا کہ ''پیشکار صاحب اب تو انکار کر دیا سو کر دیا، معاف ہیں۔'' پیشکار صاحب تو مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے، میرے عزیز مرحوم نے جو علی گڑھ کے قصبے میں بہت زیادہ ناراض سال دو سال تک رہا، یہ کہا کہ آج تو تُو نے مجھے نیچا دکھلا دیا، میں تو قرض معلوم ہونے پر کبھی بھی واپس نہ کرتا اور الٹا ان کے سر ہو جاتا، کہ کئی برس کے قرض کی ادائیگی کو بھی ایسی طرح دے رہے تھے جیسے بڑا احسان کر رہے تھے، نذرانہ دے رہے تھے۔'' مجھے بھی حماقت سوار ہوئی، ایک چبھتا ہوا فقرہ کہہ دیا ''بھائی تم بڑے لوگ ہو، رؤسا ہو، میں فقیر، غریب، ذلیل زکوٰۃ کی روٹیاں کھانے والا، تمہارا مقابلہ کہاں کر سکوں۔'' جن دو چار کو پرانا واقعہ معلوم تھا وہ تو سمجھے کہ میں نے کیا کہا، لیکن مرحوم بہت شرمندہ ہوئے۔ اور مجھے اس کے بعد سے بارہا قلق ہوا کہ کیوں حماقت کی؟ بات میں بات نکل جاتی ہے، کہیں سے کہیں بہک جاتا ہوں قصہ تو تھا معلقہ کا پہنچ گیا تحصیل بڈھانہ میں۔

آپ بیتی کے واقعات تو بہت ہی عجیب و غریب اور مالک کے ''لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی'' انعامات کے مظاہر ہیں۔

بہر حال معلقہ کا مرحلہ تو اللہ کے انعام و احسان سے ایسی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا کہ جس کا شکر ادا نہیں ہو سکتا، لیکن لوگوں پر گرانی بالخصوص ان پر جو اس کو بدلنا چاہتے تھے اور ناکام ہوئے، بلکہ ان کی کوششوں کا الٹا اثر ہوا، اور ایک مخالفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس سلسلے کی جزئیات تو بہت لمبی چوڑی ہیں لیکن اس سلسلے کا اہم مسئلہ آئندہ سال شوال ۳۷ھ میں پیش آیا، میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ ''حضرت دل یوں چاہتا تھا کہ حضرت کے زیر سایہ فقہ کی کتابیں پڑھا لیتا، ہدایہ ایک دو سال حضرت کے زیر تربیت پڑھا لیتا تو پوچھنے میں سہولت رہتی۔'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا ''بہت اچھا۔'' میں نے عینِ تقسیم اسباق سے تھوڑی دیر پہلے حضرت قدس سرہٗ سے عرض کیا تھا۔ جب

حضرت قدس سرہٗ، مہتمم صاحبؒ وغیرہ حضرات تقسیم کے لئے بیٹھے تو بیٹھتے ہی حضرت قدس سرہٗ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ ''تم نے ہدایہ اولین کو کہا تھا یا اخیرین کو؟'' میں نے عرض کی کہ حضرت! اولین کو۔ حضرت قدس سرہٗ نے مہتمم صاحب سے فرمایا ''ہدایہ اولین پہلے اس کے نام لکھ دو پھر آگے چلو۔'' اس پر سارے ہی مدرسین کی آنکھیں کھلی رہ گئیں، حتیٰ کہ جو حضرات گزشتہ سال معلقہ میں میرے حامی تھے وہ بھی سوچ میں پڑ گئے کہ کنز صرف ایک سال ہوئی ہے، اور اس وقت دستور یہ تھا کہ ہر مدرس کے پاس نئی کتاب کم سے کم تین سال ہونا ضروری تھا، اور شرح وقایہ پڑھانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ مگر حضرت کے حکم کے بعد پھر کون بول سکتا تھا۔ ہدایہ اولین لکھا گیا۔ اور جو گزشتہ سال معلقہ میں اپنی مساعی کو ناکام دیکھ چکے تھے، ان کو پھر اپنا غصہ نکالنے کا موقعہ ملا اور تقسیمِ اسباق کا نقشہ چسپاں ہوتے ہی ایک محاذ اس ناکارہ کے خلاف پیدا ہوا۔ مگر میرے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ تقسیم اسباق کے بعد اس خیال سے کہ مدرسین اور طلباء کو کتابیں لینے میں کئی دن لگیں گے سیوہارہ وغیرہ کے سفر میں تشریف لے گئے، اور یہاں حضرت مہتمم صاحبؒ پر اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے۔ ہدایہ کے تبادلہ کی یورش ہوئی۔ مولانا ثابت علی صاحب تو مہتمم صاحبؒ پر بات بات میں برسا ہی کرتے تھے، اور خوب خفا ہوا کرتے تھے، ہدایہ کے متعلق مولانا عبداللطیف صاحب نے بھی مہتمم صاحب سے کہا کہ ''طلباء میں شورش ہے اس کو بدل دینا چاہیے۔'' مہتمم صاحب نے فرمایا کہ ''آپ کو معلوم ہے کہ حضرت نے بیٹھتے ہی کس اہتمام سے ہدایہ کو لکھوایا تھا، میں تو نہیں بدل سکتا، آپ تحریری حکم بھیجیں کہ صدر مدرس ہیں، مہتمم جزئیات ہیں، نگران دارالطلبہ ہیں، آپ کے حکم کی تعمیل میں بدل دوں گا۔'' اتنی ہمت تو مولانا عبداللطیف صاحب بھی نہ کر سکے کہ حضرت قدس سرہٗ کے حکم کو تحریری حکم سے منسوخ کر سکیں۔ اس ہدایہ میں مولانا عبدالشکور صاحب کاملپوری بھی تھے جو بعد میں کئی سال مظاہر میں مدرس رہے۔ تقسیم کے بعد راولپنڈی میں مدرس ہو گئے تھے اور حال ہی میں ۲۳ رجب ۱۴۰۰ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء بروز جمعہ پونے چار بجے شام طویل بیماری کے بعد پنڈی میں انتقال ہوا۔ رَحِمَهُ اللّٰه رحمةً واسعةً واعلى اللّٰه مراتبهُ.

طلبہ نے ہدایہ کی تبدیلی کی درخواست مہتمم صاحبؒ کے نام لکھی اور سب نے اس پر دستخط کیے مگر مولوی عبدالشکور صاحب مرحوم نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا، اور انہوں نے یہ کہا کہ حضرت سفر میں ہیں یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ بغیر حضرت کے کوئی نہیں بدل سکتا، اور تمہارا سبق شروع کرنے سے پہلے یہ کہنا کہ ہم نہیں پڑھتے، اس کی کوئی وجہ نہیں، چند روز

سبق پڑھ لو، تمہیں یہ کہنے کا حق ہوگا کہ سبق ہماری سمجھ میں نہیں آتا، ابھی سے کیا عذر کرو گے؟ یہ بات طلباء کی سمجھ میں آگئی اور سبق شروع ہوگیا۔ اور معلقہ کے مخالفین نے یہاں بھی طلباء کو شہ دی، اور مولوی ادریس صاحب کی نصیحت نے یہاں بھی بہت کام دیا۔ میں نے دو تین دن تک تو مسلسل فقہ کی لغوی، اصطلاحی تعریفیں، ان کا درجہ، مصنف کے احوال، اور جو جو سمجھ میں آیا سب کچھ کہا، اور تین دن کے بعد بسم اللہ سے لے کر کتاب الطہارۃ تک ایک صفحہ پانچ دن میں پڑھایا۔ اس کے بعد بعض طلباء تو ڈھیلے پڑ گئے، لیکن بعض شری طلباء نے پھر بھی درخواست کا ارادہ کیا، مگر اکثریت نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''درخواست کا حشر معلوم ہے۔'' گھنٹہ کے نیچے سبق ہوگا۔'' یہ اس زمانے کی ایک خاص اصطلاح تھی۔ وہ یہ کہ جس مدرس کے خلاف طلباء کی طرف سے تبدیلِ سبق کی درخواست ہوتی تھی تو عین سبق کے وقت بلا پہلے سے کسی اطلاع کے حضرت قدس سرہٗ کا حکم مدرس کے پاس پہنچتا تھا کہ ''سبق گھنٹے کے نیچے ہوگا۔'' اور گھنٹہ سے مراد وہ گھنٹہ ہوتا تھا جو مدرسہ قدیم میں حضرت قدس سرہٗ کی سہ دری میں لگ رہا تھا۔ جواب تک اسی جگہ ہے مدرس گھنٹے کے نیچے بیٹھتا، طلباء چاروں طرف اور حضرت نور اللہ مرقدہٗ اَعْلَی اللّٰہُ مَرَاتِبَہ' اپنے حجرہ مبارک کے دروازے پر اپنی مخصوص جگہ پر جو ہر وقت حضرت کے بیٹھنے کی تھی، تشریف رکھتے، طالب علم اس وقت میں مدرس کو خوب دق کرتے اور مدرس، حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے مرعوب بھی بہت ہوتا۔ ایک مصیبتِ عظمیٰ کا وقت ہوتا تھا۔ حضرت اس وقت کچھ نہیں فرماتے تھے، اگر حضرت کے نزدیک طلباء کی شکایت بجا ہوتی تو مدرس کو خاص طور سے مطالعہ کی تنبیہ فرماتے، مگر تنہائی میں۔ اور اگر طلباء کی شکایت زیادہ قوی ہوتی اور مدرس کا نقص حضرت کے ذہن میں آجاتا تو پندرہ بیس دن بعد وہ کتاب کسی بہانے سے بدل دی جاتی اور اگر طلباء کی شکایت غلط ہوتی تب تو نمبر ۱ معمولی تنبیہ، نمبر ۲ شرّی لوگوں کا حسب مناسب وقت کھانا بند، نمبر ۳ شری لوگوں کا اخراج۔ یہ قانون سب لوگوں کو معلوم تھا، اس لئے اکثریت نے شدت سے انکار کیا کہ ہم دستخط نہیں کریں گے۔ درخواست کا حشر، گھنٹہ کے نیچے سبق ہوگا اور اس کا حشر معلوم ہے کہ اخراج اگر نہ ہوا تو کھانا تو کم از کم بند ہو ہی جائے گا۔ اس پر وہ درخواست رُل گئی۔

اس سیہ کار کے ساتھ یہ دو واقعے تو مخالفت کے پیش آئے، اللہ کے فضل سے ان دو کے علاوہ کوئی واقعہ ان چون ۵۴ سالہ مدرسی میں طلباء کی طرف سے اعراض یا ناگواری کا پیش نہیں آیا۔ بلکہ طلباء اور اس سیہ کار کی طرف اسباق کے منتقل ہونے کی مساعی کے پیش آتے رہے۔

بلکہ ۱۳۴۱ھ میں حضرت قدس سرہٗ کی طرف سے ایک اہم واقعہ پیش آ گیا۔ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں شوال میں ترمذی دو گھنٹے ہوا کرتی تھی اور صفر کے آخر میں عموماً ختم ہو جاتی تھی۔ اور اس کے بعد اُنھی دو گھنٹوں میں بخاری شریف شروع ہوتی اور اوائل رجب میں ختم ہو جایا کرتی یہ ہمیشہ کا دستور تھا۔ حضرت قدس سرہٗ اس کے سخت مخالف تھے اور بار بار مدرسین پر نکیر بھی کرتے تھے کہ شروع سال میں لمبی لمبی تقریریں کی جائیں اور اخیر سال میں رمضانی حافظ کی طرح بلا تقریر کتاب پوری کرائی جائے۔ مولانا عبداللطیف صاحب کے یہاں چونکہ ترمذی، بخاری کی شروعات تھیں، اس لئے دوسرے مدرسین کی طرح ابتداء میں تقاریر کا زور ہوا اور جمادی الاخریٰ کے ختم تک بخاری کی ایک جلد بھی پوری نہ ہوئی۔ حضرت خوب ناراض ہوئے اور مہتمم صاحب سے فرمادیا کہ بخاری کے پارے دوسرے مدرسین پر منقسم کر دیئے جائیں۔ اس سیہ کار کا نام بھی خاص طور پر لیا۔ اس کو بھی کچھ پارے دے دینا۔ یہ فرما کر حضرت تو ایک دو دن کے لئے کسی سفر میں بلند شہر وغیرہ کہیں تشریف لے گئے۔ مجھ پر اس قدر بوجھ ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے مشکوٰۃ بھی اس وقت تک نہیں پڑھائی تھی۔ میں نے مہتمم صاحبؒ سے عرض کیا کہ ”بہت نامناسب ہوگا۔ آپ مجھے ہرگز نہ دیں۔ حضرت مولانا ثابت علی صاحب اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب ہی کو دیں۔“ مہتمم صاحب نے بھی موافقت کی۔ ان دونوں حضرات کو پانچ پانچ پارے دے دیئے گئے اور ساتھ آٹھ پارے مولانا عبداللطیف صاحب کے پاس بدستور رہے۔ تیسرے دن حضرت سفر سے واپس تشریف لائے، میں ڈاک لکھ رہا تھا۔ مہتمم صاحب سے دریافت کیا، ”پارے بانٹ دیئے؟“ مہتمم صاحب نے عرض کیا ”حضرت تقسیم کر دیئے اس نے لینے سے انکار کر دیا۔“ حضرت اس سیہ کار پر خوب ناراض ہوئے۔ فرمایا ”بہت اچھا۔ انکار کر دیا تو ہماری پاپوش سے یوں چاہتے ہیں کہ ہماری خوشامد ہو۔“

حضرت قدس سرہٗ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ غصہ میں چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ تھوڑی دیر حضرتؒ نے سکوت فرمایا اور پھر نعلین شریفین اٹھا کر مکان تشریف لے جانے لگے۔ میں نے جلدی سے حضرت کے ہاتھ سے نعلین شریفین لے لئے اور پیچھے پیچھے دروازے تک گیا۔ دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر میری طرف متوجہ ہو کر نہایت غصہ میں فرمایا: ”کچھ کہنا ہے؟“ میں نے عرض کیا کہ ”حضرت تو ناراض ہی ہو گئے۔“ فرمایا ”ناراض نہ ہوں جب میرا کہنا نہ مانا۔“ میں نے کہا ”حضرت! توبہ توبہ مجھے تو یہ خیال ہوا کہ مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی۔ دوسرے مدرسہ والے کیا کہیں گے کہ نوعمر لڑکے کو جس نے مشکوٰۃ بھی نہیں پڑھائی،

بخاری دے دی۔'' حضرت نے فرمایا کہ ''نوعمر لڑکے کو میں کیا جانوں، دوسرے لوگ کیا جانیں، اگر کوئی الزام دے گا تو مجھے دے گا۔ تمہیں تو نہیں دے گا۔'' میں نے عرض کیا کہ ''حضرت مجھے تعمیل ارشاد میں کیا انکار ہے۔'' حضرت نے فرمایا ''کہنا مان لوگے میں راضی ہوجاؤں گا۔'' میں وہاں سے آکر مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے کہا کہ ''آپ نے تو پٹواہی دیا۔'' آپ کو بحیثیت مہتمم کہنا چاہیے تھا کہ اس کے پاس مناسب نہیں تھا، اس لئے میں نے نہیں دی۔'' مہتمم صاحب نے فرمایا ''ہاں مجھے پٹوانا چاہتا تھا۔'' اسی وقت از ۱۳ تا ۱۵ پاروں کا اعلان اس سیہ کار کے نام ہوا۔ اس بخاری شریف میں قاری سعید مرحوم بھی تھے جو بعد میں مفتی اعظم مظاہر علوم ہوگئے تھے۔

ممکن تھا کہ اس بخاری پر کوئی معلقہ یا ہدایہ کی طرح خرخشہ اٹھتا، لیکن طلباء میں میرے انکار اور حضرت قدس سرہٗ کی ناراضگی کا شہرہ قاری سعید مرحوم کے ذریعے اعلان سے پہلے ہی ہوگیا تھا، اس لئے اگر کوئی کہنا بھی چاہتا تو اس واقعے کے بعد کس کی ہمت پڑ سکتی تھی۔

اسٹرائک کی لعنت مدرسے میں نہیں تھی

اسٹرائک کی لعنت اس وقت تک ہمارے مدارس میں نہیں آئی تھی۔ مدارس عربیہ والے اس منحوس لفظ کو جانتے ہی نہ تھے کہ کیا ہوتا ہے، اس وقت تک ہر بڑے چھوٹے کے نزدیک مدرسہ کے احسانات اہم اور قابل لحاظ تھے۔

ایک اصول جو میرے اکابر کے یہاں خاص طور سے تھا کہ دوسروں کے جو حقوق اپنے ذمہ ہوں ان کو ادا کرنا اپنا فریضہ ہے اور اپنے حقوق جو دوسروں کے ذمہ رہ جائیں، ان کی وصولی کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ میرے والد صاحبؒ قدس سرہٗ کا خاص طور سے اس قانون پر عمل تھا، وہ کسی بات میں یہ نہیں سوچتے تھے کہ دوسرا کیا کر رہا ہے، وہ ہر بات میں یہ سوچتے تھے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے ملفوظات میں بھی اور عزیز یوسف مرحوم کی تقاریر میں بھی یہ مضمون بہت کثرت سے ملے گا اور حدیث پاک سے بھی مستنبط ہوتا ہے:

''لَیْسَ الوَاصِلُ بِالْمُکَافِی وَلٰکِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِیْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَ''.

''صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو برابر سرابر کا معاملہ رکھے، یعنی یوں کہے کہ جیسا وہ کرے گا ویسا میں کروں گا۔ بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کے ساتھ قطع رحمی کی جائے تو وہ قطع رحمی کرنے والے کے ساتھ بھی صلہ رحمی کرے۔'' (مشکوٰۃ عن البخاری)

مدرسین کا مدرسہ کی خدمت

مدرسہ کے معاملات میں نہ صرف اس ناکارہ کا، بلکہ اس زمانے کے تقریباً ہر مدرس اور ملازم کا یہ قانون اور اصول موضوعہ کے طور پر طے شدہ مفروضہ تھا کہ ہمارا کوئی حق مدرسہ پر نہیں، جو مدرسہ کی طرف سے مل رہا ہے وہ اللہ کا احسان اور اسی کا عطیہ ہے۔ اور ثانیاً مدرسہ کا احسان ہے اور ہم لوگوں کا کوئی حق مدرسہ پر نہیں، اور مدرسہ کا ہر کام چاہے کتنا ہی معمولی سا ہو حتیٰ کہ درس گاہ میں جھاڑو تک دینے سے بھی مدرس کو عار نہیں تھا۔

اس زمانے میں یاد نہیں کہ استنجاء کے ڈھیلوں کی اینٹوں کے لئے یا حمام کے لکڑیوں کے لئے کسی ملازم یا مزدور کو بلانے کی ضرورت کبھی پیش آئی ہو۔ میں نے دربان سے کہہ رکھا تھا کہ جب اینٹوں یا لکڑیوں کی گاڑی آئے، اوپر درس گاہ میں مجھے اطلاع کردے۔ میں گھنٹے کے ختم پر ایک طالب علم کو مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے پاس یہ کہہ کر بھیج دیتا تھا کہ ''اینٹیں آئی ہوئی ہیں، میں نیچے جارہا ہوں۔'' مولانا مرحوم بھی فوراً نیچے پہلے پہنچ جاتے۔ اور ہم دونوں کو جاتے دیکھ کر دونوں کے یہاں کی جماعتیں ایسی دوڑتیں کہ ہم سے پہلے وہاں پہنچ جاتے۔ ہم دونوں کو ایک پھیرا بھی مشکل سے کرنا ہوتا تھا کہ راستے میں کوئی طالب علم چھین لیتا تھا۔ لیکن اینٹیں ہوں یا لکڑیاں دو تین منٹ سے زائد گاڑیوں کے خالی ہونے میں نہ لگتے تھے، بہت سے طالب علموں کو ایک ہی پھیرا کرنا پڑتا تھا۔ نوعمر لڑکے اپنی طاقت دکھانے کیلئے ۲ پھیرے کر لیتے تھے۔

بہت سی جزئیات اس نوع کی ملیں گی۔ اب اس کے بالمقابل یہ منظر دیکھ کر کسی ملازم سے یوں کہیں کہ پنکھا اٹھادے تو یہ سوچ کر کہ یہ میرا کام نہیں، اس کا معاوضہ کیا ہوگا۔ کسی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔ ؎

ان نینوں کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

تعلیمی مخالفت کے متعلق لکھا جاچکا، معلقہ اور ہدایہ کے علاوہ کسی تعلیمی سلسلے میں مخالفت نہیں ہوئی۔ البتہ انتظامی سلسلے کے درمیان مختلف محاذ میرے خلاف شروع سے رہے اور بالکل سمجھ میں نہیں آیا کہ جتنا میں اس لائن سے بھاگا اتنا ہی میرے سر تھوپی گئی اور غور کے باوجود بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ مصیبت میرے کیوں لادی گئی؟

غالباً ۳۸ھ یا ۳۹ھ کا واقعہ ہے، میرے حضرت قدس سرہٗ اَعْلَی اللّٰہ مرَاتِبہٗ بہاولپور تشریف لے جارہے تھے اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نوراللہ مرقدہٗ بھی

ہمرکاب تھے اور ہمارے مدرسہ کے ایک مدرس بھی ساتھ تھے، جو میرے بڑے مخلص، ان کا کھانا پینا اکثر میرے ساتھ، چائے تو مستقل میرے ساتھ پیتے ہی تھے، انہوں نے بہاولپور کے راستے میں بہت ہی اخلاص ومحبت اور انتہائی راز میں ناظم صاحب سے کہا کہ ''میں آپ سے ایک بات بہت اخلاص سے راز میں کہتا ہوں، یہ مولوی زکریا جو حضرت کے ساتھ اتنی چاپلوسی ہر وقت کرتے ہیں، ان کا مقصد حضرتؒ کے بعد حضرت کی جگہ قائم مقام ہونے کا ہے، آپ کو گرانے کے لئے یہ سب کچھ کیا جارہا ہے۔'' ناظم صاحب کو اللہ بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے، انہوں نے کسی تصنع سے نہیں بہت اخلاص سے اس مرحوم سے یوں کہا: ''اگر مولوی زکریا کا ایسا ارادہ ہو تو وہ یقیناً اس کے بہت اہل ہیں، میں ان کے لئے کوشش کروں گا۔'' اور اتنا زور باندھا کہ وہ بیچارے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اس کے بعد ناظم صاحب نے حضرت قدس سرہٗ سے ان کا یہ مقولہ نقل کر کے اپنی طرف سے بہت پرزور سفارش کی، ''حضرت! مولوی زکریا اس کے بہت اہل ہیں، حضرت ان کو نائب ناظم بنادیں، میں ان کی انتہائی مدد کروں گا۔'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا: ''وہ صاحب تو بے وقوف ہیں، اس سے تو میں واقف ہوں، اسے تو کوئی بنائے گا جب بھی نہیں بنے گا۔'' حضرت قدس سرہٗ نے بالکل صحیح فرمایا، مجھے اس سے ہمیشہ بہت ہی وحشت رہی۔

۱۳۴۴ھ میں میرا حج کا ارادہ بالکل نہیں تھا، شادی بھی ہو چکی تھی، دو بچیاں بھی ہو چکی تھیں اور ایک بچہ پیدا ہو کر انتقال کر چکا تھا، چوتھے کی امید تھی، قرضہ بدستور تھا۔ تعلیم میں اونچے مدرسوں میں شمار تھا، حدیث کے اسباق شروع ہو چکے تھے۔ شعبان ۱۳۴۴ھ میں حضرت قدس سرہٗ نے اپنی غیبت کے لئے جو انتظامات لکھوائے اس میں اس سیہ کار کو صدر مدرس بنایا، اور حضرت عبداللطیف صاحب کو ناظم مدرسہ۔ وہ تحریر تھی تو بڑی راز میں، حضرت مہتمم صاحب لکھنے والے تھے، لیکن اس ناکارہ سے زیادہ راز نہیں تھا، اس لئے کہ وہ کاغذات اس ڈاکے کے تھیلے میں رہتے تھے جو میرے پاس رہتا تھا اور جب میں نے یہ پڑھا کہ اس سیہ کار کا نام مدرس اول میں لکھا گیا تو میرا دماغ چکرا گیا، اس لئے میری نگاہ میں مدرس اول کے فرائض بہت سخت تھے سارے مدرسے کی تعلیم کا صدر مدرس واحد ذمہ دار، مدرسین کی تعلیم کی نگرانی بھی شرعاً عقلاً عرفاً اس کے ذمے۔ اس سے زیادہ مصیبت یہ تھی کہ جہاں کوئی علمی اجتماع یا کسی اونچی جگہ مدرسہ کا کوئی خصوصی احتفال ہوتا، صدر مدرسہ کے نام وارنٹ ہوتا کہ ''آپ آیئے۔'' میں نے حضرت قدس سرہٗ سے جب وہ اوپر پیشاب کے لئے تشریف لے جارہے تھے اور یہ ناکارہ استنجاء کا لوٹا لے کر ریا کاری سے پیچھے پیچھے گیا

اور جب حضرت استنجاء سکھلا رہے تھے، میں نے بہت سوکھا سامنہ بنا کر یوں عرض کیا، "حضرت بذل کا کیا ہوگا؟" حضرت قدس سرہٗ نے بہت قلق کے ساتھ فرمایا کہ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگا؟" تمہارے بغیر تو میں لکھ نہیں سکتا اور تمہارے جانے کی کوئی صورت نہیں، اہل وعیال ساتھ ہیں، طویل قیام ہے۔" میں نے عرض کیا کہ حضرت اب تو یہ خیال ہے کہ "میں حجاز چلوں۔" حضرت قدس سرہٗ کا چہرہ اس وقت مجھے خوب یاد ہے خوشی سے کھل گیا۔ استنجاء پاک کر کے وضو کر کے نیچے تشریف لائے اور بیٹھ کر فرمایا، "تمہارے خرچ کا کیا ہوگا؟" میں نے عرض کیا کہ "حضرت اس کا تو بالکل فکر نہیں کریں۔ میں ۳۸ھ میں بھی قرض لے کر گیا تھا، حالانکہ اس وقت ملنا بہت دشوار تھا اور اس وقت بہت آسان ہے، اب بھی لے لوں گا۔" حضرت نے فرمایا "تمہاری مدرسہ میں تنخواہ بھی کچھ جمع ہے۔"

اس کی شرح یہ ہے کہ ۳۵ھ میں جب میں ملازم ہوا تھا اور میری تنخواہ پندرہ روپے ہوئی تھی۔ اس وقت بڑے حضرت اقدس رائے پوری شاہ عبدالرحیم صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے مدرسہ میں تو سفارش کی تھی کہ "پندرہ روپے تنخواہ بہت کم ہے، کم از کم پچیس روپے ہونی چاہیے۔" اور مجھ سے یوں ارشاد فرمایا کہ "جب اللہ توفیق دے مدرسہ کی تنخواہ چھوڑ دینا۔" جس کا اثر یہ تھا کہ میرا حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے ارشاد کی وجہ سے تو تنخواہ لینے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا، مگر میرے حضرت قدس سرہٗ لیتے تھے، اگرچہ میرے والد صاحبؒ نے بھی نہیں لی، پھر بھی چونکہ میرے حضرتؒ لیتے تھے اس لئے نہ لینا بے ادبی سمجھتا تھا، اس لئے کسی ماہ میں اس کا غلبہ ہوتا تھا کسی ماہ اسکا، البتہ نہ لینے کی وجہ سے میری ترقیاں رکتی رہیں، جب مدرسین کی ترقی کا وقت آتا اور دوسرے مدرسین کی ترقی ہوتی تو میں اس سے پہلے مہینوں میں تنخواہ لینے والا ہوتا تو میری بھی چار پانچ روپے ترقی ہو جاتی اور جس زمانے میں تنخواہ نہ لیتا، مہتمم صاحب فرما دیتے "وہ تو پہلے ہی سے نہیں لیتا، اس کی کیا ترقی؟"

بہرحال محرم ۳۵ھ سے شعبان ۴۴ھ تک لعما لعہ نوسو پچتالیس روپے میری تنخواہ کے جمع تھے جو اس زمانے میں حج کے اخراجات سے بہت زائد تھے، حج کا خرچ اس زمانے میں زیادہ سے زیادہ کا سما چھ سو روپے تھے۔ حضرتؒ کے ذہن میں یہ تھا کہ بقدر اخراجات لے کر بقیہ اول وعیال کے خرچ کے لئے دے دیئے جاویں۔ میں نے عرض کیا کہ "حضرت اس کا فکر نہ فرماویں، خرچ کا انتظام ہو جائے گا، اس تنخواہ کا لینا تو جائز نہیں۔" حضرت کی خدمت میں گستاخ تو ہمیشہ ہی رہا۔ حضرت نے فرمایا "کیوں؟" عرض کیا حضرت جن مہینوں کی تنخواہ نہیں لی ان میں اس نیت سے پڑھایا کہ تنخواہ نہیں لوں گا، اب

اس کے لینے کا کیا حق ہے؟'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ''تم نے کوئی درخواست مدرسہ کودی؟ تم اَجِیر تھے، مدرسہ مُستَأجر، تمہیں یک طرفہ فسخ اجارہ کا کیا حق تھا؟ جب تک کہ ہم قبول نہ کریں۔'' میں نے عرض کیا ''حضرت اس میں اجارے کی تو کوئی بات نہیں، ایک شخص کام کرتے ہوئے یہ نیت کرلے کہ لِوَجْہِ اللہ کررہا ہوں اس کے بعد معاوضہ لینے کا کیا حق ہے؟'' حضرت ناظم صاحب بھی تشریف فرما تھے انہوں نے حضرت سے عرض کیا ''حضرت میں انہیں سمجھادوں گا۔'' حضرت بہت خوش ہوئے اور میں بھی بہت خوش ہوا، حضرت کے سامنے تو میں بہت ادب سے ڈرتے ڈرتے کوئی لفظ کہوں گا، اور ناظم سے خوب کھل کر مناظرہ ہوا، انہوں نے حضرت سے عرض کردیا کہ ''حضرت یہ نہیں مانتا'' حضرت تھانوی قدس سرہٗ بھی مدرسہ کے سرپرستوں میں تھے، اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی تھانہ بھون کے مفتی اعظم اور مجھ سے بے حد بے تکلفی، میں نے ان سے کہا کہ ''مدرسہ کے کاغذات میری تنخواہ کے سلسلے میں حضرت کے پاس آویں گے، حضرت سے میری تنخواہ نامنظور کرادیجیو۔'' انہوں نے حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے نہ معلوم کیا کہا، جب میری درخواست ڈیڑھ سال کی چھٹی کی اور مہتمم صاحب کی طرف سے اس پر یہ تحریر کہ اس کی تنخواہ بھی کچھ رکی ہوئی ہے اس کے دینے کی بھی اجازت دی جائے۔ تو حضرت تھانویؒ نے چھٹی بخوشی منظور فرمائی، اور تنخواہ کے متعلق تحریر فرمایا کہ ''اگر قبض الوصول میں تنخواہ درج ہے اور انہوں نے وصول نہیں کی تو اس میں سرپرستان سے اجازت کا کیا مطلب؟ دی جائے، اور اگر اس میں کوئی اور اشتباہ ہے تو اس کو ظاہر کیا جائے تاکہ اس پر غور کیا جائے۔'' مولانا عاشق الٰہی صاحب بھی اس وقت سرپرست بنائے گئے تھے، یہاں آئے، میں نے ان سے بھی عرض کیا کہ ''تم سرپرست ہو اس تنخواہ کا لینا میرے لئے جائز نہیں، اسے نامنظور کردیجئے۔'' لیکن حضرت قدس سرہٗ کی منظوری کے بعد حضرت تھانویؒ تو رد فرماسکتے تھے، خدام میں سے کس کو ہمت پڑتی؟ یہ گستاخیاں تو اللہ میاں نے اس ناکارہ کے حق میں رکھی تھیں، جو ہمیشہ کرتا رہا، مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اول تو مجھ سے مناظرہ کیا، اور جب ناظم صاحب کی طرح وہ بھی مناظرے میں غالب نہ آئے تو انہوں نے بحیثیت سرپرست میرے کاغذ پر لکھا ''ڈیڑھ سالہ رخصت منظور ہے اور تنخواہ کے سلسلے میں جیسا کہ اس کی طرف سے رخصت کی درخواست ہے، اسی کی طرف سے یہ درخواست بھی ہونی چاہیے کہ میری تنخواہ مدرسہ سے دلوائی جائے۔'' حضرت قدس سرہٗ نے جب حضرت میرٹھی کی تحریر دیکھی تو سمجھ گئے کہ میرا ان سے بھی مناظرہ ہوا تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے بہت ہی

شفقت سے مجھ سے یوں فرمایا کہ ''بذل میرا ذاتی کام تو نہیں، مدرسہ ہی کا کام ہے، اگر میں سرپرستان کی منظوری کے بعد تمہیں بکارِ مدرسہ اپنے ساتھ لے جاؤں اور آمدورفت کے خرچ کے علاوہ وہاں کے قیام کی تنخواہ مدرسہ سے دلواؤں تو تم کیا کہو گے؟'' میں نے عرض کیا: ''حضرت! یہ عرض کروں گا بالکل جائز ہے ذرا تردد نہیں۔'' حضرت نے فرمایا ''تمہاری طے شدہ تنخواہ تو بہت کم ہوگی جتنا کہ اس صورت میں مدرسہ تم کو دے گا۔'' میں نے کہا ''بالکل صحیح ہے۔'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا ''پھر تم یہی سمجھ لو۔'' اس پر میں نے تنخواہ تو لے لی، لیکن حضرت رائے پوریؒ کی نسبت کچھ ایسا غالب تھا کہ مدینہ منورہ پہنچ کر میں نے سب سے پہلے مہتمم صاحب کو ایک خط لکھا، جس میں اس تنخواہ کا کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ یہ لکھا کہ ''میرا ارادہ ایک عرصہ سے مدرسہ کے ان حقوق کے معاوضہ میں جو مجھ پر ہیں مدرسہ میں ایک بڑی رقم پیش کرنے کا ہو رہا ہے مگر آپ کو معلوم ہے کہ مجھ سے جمع ہونا ناممکن ہے، اس لئے بالفعل میری طرف سے صرف ایک ہزار روپے کا وعدہ اس طرح تحریر فرمالیں کہ ۱۰ جمادی الاولیٰ سے مبلغ پانچ سو روپے ماہانہ میری واپسی تک میرے کارکن مولوی نصیر الدین سے اور بعد واپسی کے خود مجھ سے وصول فرماتے رہیں، اگر اس کے پورا ہو جانے سے قبل میرا انتقال ہو جائے تو اس وقت جس قدر رقم باقی ہو وہ میری وصیت ہے جو کہ متروکہ سے وصول کی جائے۔'' الخ محررہ از مدینہ طیبہ۔ ۵ جمادی الاولیٰ ۴۵ھ۔

اللہ کے فضل سے جب یہ رقم ادا ہو گئی تو مجھے رائپوری جذبہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے پہلے زمانہ میں جو تنخواہیں لی ہیں وہ بھی واپس کر دی جائیں۔ اللہ نے وہ بھی واپس کرا دیں۔

لِلّٰہِ الْحَمْدُ وَا لِمِنَّۃُ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُکرُ کُلُّہٗ،
اَللّٰھُمَّ لَااُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ، اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلیٰ نَفْسِکَ.

ذیقعدہ ۴۵ھ میں جب اس ناکارہ کی بذل کے اختتام کے بعد واپسی ہونے لگی تو حضرت مولانا سید احمد صاحب قدس سرہٗ بانی مدرسہ شرعیہ نے میرے وہاں مستقل قیام پر بہت اصرار کیا، اور میرے حضرت قدس سرہٗ سے بار بار درخواست کی، ''مدرسہ شرعیہ کی صدر مدرسی کے لئے اس کو قیام کی اجازت دے دیں۔'' مگر میرے حضرت قدس سرہٗ نے یہ فرمایا کہ ''آپ کا مدرسہ ابھی ابتدائی ہے، اور مظاہرِ علوم عروج پر ہے، اس کے لئے اس کے واپس جانے کی ضرورت ہے، میری غیبت میں اس کا قیام وہاں ضروری ہے، اس کے نہ جانے سے مدرسہ کو نقصان کا اندیشہ ہے۔'' مولانا سید احمد صاحب کا ارشاد تھا جس کو انہوں نے حضرت

سے بھی کئی بار عرض کیا کہ میں مولوی الیاس کے پاس اس کے بیوی بچوں کا کرایہ بھیج دوں وہ پہنچا دیں گے۔ مگر حضرت نے قبول نہ کیا، اور میری واپسی کے وقت حضرت نے جب عارضی غیبت کے انتظامات کو مکمل فرمایا تو بڑی لمبی تحریر مدرسہ کے انتظامات کے سلسلہ میں حضرت مولانا سید احمد صاحب سے لکھوائی، اس میں سیہ کار کے متعلق دو نمبر لکھوائے۔

بندہ کی مشیر ناظم کی تجویز

ایک یہ کہ زکریا کو حدیث سے جتنی مناسبت ہے، میں اسے خوب جانتا ہوں، اس لئے اس کو مدرسہ کا شیخ الحدیث تجویز کرتا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صدر مدرس حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب ایک سال پہلے ہو چکے تھے، ان کو اس عہدہ سے ہٹانے کی کوئی وجہ نہیں تھی، اس عہدہ کی ابتداء اس سیہ کار سے ہوئی، ورنہ اس سے پہلے مدارس میں مدرسِ اول اور شیخ الحدیث ایک ہی عہدہ تھا۔ حضرت اقدس مدنی قدس سرہٗ نے کئی مرتبہ تفریحاً ومزاحاً یہ ارشاد بھی فرمایا کہ ''یہ نیا عہدہ آپ کی خاطر تصنیف کیا گیا ہے۔'' مگر پھر دارالعلوم کو بھی ایسی ہی مجبوری کی وجہ سے شیخ الحدیث اور مدرسِ اول دو عہدے بنانے پڑے۔ حضرت قدس سرہٗ کی یہ تحریر جب یہاں پہنچی اور حضرات سرپرستان کے یہاں منظوری کے لئے گئی تو اور تو کون انکار کرتا حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس پر ایک اشکال فرمایا کہ ''ان سے پہلے اکابر مدرسین مولانا ثابت علی صاحب، مولانا عبداللطیف صاحب وغیرہ موجود ہیں، ان کے لئے یہ تفوق موجبِ تکدر نہ ہو، اس کو غور کر لیا جائے۔'' حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ نے حضرت تھانوی کا یہ اشکال میرے حضرت کو لکھا تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے جواب میں لکھا کہ ''اگر اہلِ مدرسہ کو مِن حیث المدرسہ مدرسہ کی طرف سے اس میں کوئی تردد ہے تو میں اپنی طرف سے یہ خطاب اس کو دیتا ہوں۔'' حضرت قدس سرہٗ کی برکت سے اس نے ایسی شہرت پائی کہ نام سے زیادہ مشہور ہو گیا۔

انگریزوں کے زمانے میں حضرت قدس سرہٗ کے تار بہت کثرت سے کراچی، لکھنؤ، کلکتہ وغیرہ سے آتے تھے، ان میں پتہ صرف ''شیخ الحدیث صاحب سہارنپورؒ'' ہوتا، مدرسہ کا نام بھی نہیں ہوتا تھا، مگر پہنچ جاتے تھے۔

دوسرا نمبر میرے حضرت قدس سرہٗ نے اس سیہ کار کے متعلق ''نائب ناظم مدرسہ'' کا لکھا۔ اس عہدے سے مجھے اس سے بھی زیادہ وحشت ہوئی جتنی ایک سال پہلے صدر مدرسی کے عہدے سے ہوئی تھی، میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ اس انتظامی جھگڑے میں پڑ کر پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ تو جاتا رہے گا، ناظم صاحب کے مزاج میں

پھیلاؤ بہت ہے، یہ ساری مصیبت مجھے بھگتنی پڑے گی۔ یہ تحریر حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے قلم کی تھی، میں نے حضرت مرحوم سے بہت ہی خوشامد لجاجت سے عرض کی کہ ''اس مصیبت کو میرے سے ہٹایئے۔'' انہوں نے کہا، حضرت کی تجویز ہے تمہیں خوش ہونا چاہیے۔'' چنانچہ میں نے بڑی خوشامد کی اور یاد پڑتا ہے کہ پاؤں بھی پڑے، اور آبدیدہ ہوکر ان سے درخواست کی، انہوں نے میری حالت دیکھ کر حضرت سے عرض کیا کہ حضرت میں نے اس تحریر کا ذکر یا سے ذکر نہیں کیا، مگر معلوم نہیں کہ اس نے کہاں سے دیکھ لی، تو اس سے بہت ہی گھبرا رہا ہے اور رنجیدہ ہے، یوں کہتا ہے کہ میرا علمی حرج بہت ہو جائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ ''مجھے اس پر اطمینان ہے کہ وہ اپنا علمی حرج بالکل نہیں کرے گا، اس نے تو مجھے بھی کبھی رسید نہیں دی، وہ ان موجودہ سرپرستوں کے بس کا نہیں۔ یہ سرپرست اس سے کوئی ایسا کام نہیں لے سکتے جس میں اس کا حرج ہو۔''

حضرت مولانا سید احمد صاحب سے مایوس ہوکر میں نے حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کے پاؤں پکڑے کہ حضرت مولانا کو بھی حضرت قدس سرہٗ نے اپنی روانگی حجاز ۴۴ھ میں مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ اور شیخ رشید احمد صاحب کے ساتھ مدرسہ کا سرپرست بنایا تھا۔ میں نے حضرت رائپوری سے عرض کیا کہ ''وہ تحریر آپ کو بحیثیت سرپرست ضرور دکھائی جائے گی اللہ کے واسطے اس کو منظور نہ کریں''۔ حضرت رائپوری نے فرمایا ''بھلا ایسا کیونکر ہوسکتا ہے کہ حضرت ایک تحریر لکھیں اور میں اس پر انکار کروں۔'' چنانچہ جب وہ تحریر مکمل ہوگئی تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے حضرت رائپوری کو بحیثیت سرپرست وہ تحریر دکھلائی اور اس کی تاکید فرمائی کہ ''کوئی اشکال ہو تو ضرور کہیں، میرے لکھنے کی وجہ سے سکوت نہ فرماویں۔'' اور میں اس وقت تک یاد ہے، بڑی لجاجت سے اس دعا میں مشغول تھا کہ ''یا اللہ! یہ مصیبت مجھ سے ہٹا لے۔'' جب حضرت رائپوری اسے ملاحظہ فرما چکے اور حضرت قدس سرہٗ نے پوچھا ''کوئی اشکال تو نہیں'' تو حضرت رائپوری نے اپنی عادت کے موافق اول تو بڑی توبہ کی، ''حضرت توبہ توبہ! حضرت کی تحریر میں کیا اشکال ہوگا؟'' مگر حضرت قدس سرہٗ کو بھی حضرت رائپوری کی عادت اتباع کی معلوم تھی، اس لئے کئی دفعہ اصرار فرمایا کہ ''کوئی اشکال ہو تو فرمادیں۔'' اس پر حضرت نے بھر یہ کہہ دیا کہ ''حضرت بڑی بے ادبی ہے، گستاخی ہے، ایک خلجان توبہ توبہ یہ پیش آیا کہ سلسلۂ زکریا کے متعلق حضرت نے دو نمبر لکھے پہلے نمبر میں تو ان کی حدیث دانی کو اور علو شان کو لیا یہ فرمایا کہ مدرسہ میں کوئی ان جیسا حدیث داں نہیں ہے اور دوسرے نمبر میں حضرت نے ان کو نائب لکھا۔'' حضرت نے بے تکلف کاغذ اپنے دستِ مبارک میں لے کر ''نائب'' کے لفظ پر

اپنے دستِ مبارک سے قلم پھیر کر اس کے اوپر ''مشیر'' کا لفظ لکھ دیا۔ ''مشیرِ ناظم'' کا عہدہ مدرسہ میں پہلے بھی تھا کہ کئی سال قبل حضرتِ اقدس تھانوی قدس سرہٗ نے سرپرستی کی ذمہ داریوں سے معذوری ظاہر کر کے سرپرستی سے استعفاء دیا تھا۔ اس وقت میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے والد مولانا جمعیت علی صاحبؒ دونوں مشیرِ ناظم تجویز کئے گئے تھے۔

یہاں واپسی کے دو تین سال بعد حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ، شیخ رشید احمد صاحبؒ، اور مولانا سرِ رحیم بخش صاحب تینوں کا مشورہ بعض امور کی بناء پر یہ ہوا کہ نظامت کے دو حصے کئے جائیں، ایک ناظمِ تعلیمات اور دوسرا ناظمِ مالیات۔ ناظمِ مالیات کا عہدہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے سپرد رہے اور ناظمِ تعلیمات کا عہدہ اس ناکارہ کی طرف منتقل کیا جائے۔ اس تجویز کے وقت میں بھی اس ناکارہ نے بہت ہی شدت سے خلاف کیا، مگر ان تینوں بزرگوں نے میرے شدید اختلاف کے باوجود یہ تجویز مدرسہ میں پاس کر کے ''احکامِ سرپرستاں'' میں لکھ کر بقیہ حضرات سرپرستان سے بھی منظوری کرالی۔ ان کی تشریف بری کے بعد میں نے الحاج شیخ رشید احمد صاحب نوراللہ مرقدہٗ کو ایک زوردار خط لکھا، جس میں میں نے لکھا کہ ''میرے اور ناظم صاحب کے تعلقات اس قدر مضبوط اور بہتر ہیں کہ اگر ایک جان دو قالب کہا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ ناظم صاحب میرا اس قدر لحاظ فرماتے ہیں کہ گویا مجھے بڑا بنا رکھا ہے، اور وہ تو میرے استاذ ہیں، اس تجویز کے بعد تعلقات میں وہ خوشگواری ہرگز نہیں رہ سکتی جو پہلے تھی، یا تو اس تجویز کو منسوخ فرماویں، ورنہ انشاء اللہ آپ حضرات تلاش کرتے پھریں گے کہ زکریا نامی بھی کوئی شخص مظاہر علوم میں کبھی تھا۔'' شیخ صاحب کو اللہ جزائے خیر عطا فرمائے، بہت ہی بلند درجے عطا فرماوے، بہت ہی مدبر، دروا ندیش، مدرسہ کے معاملات میں اپنے جذبات کو ہمیشہ پسِ پشت ڈالا۔ مرحوم کے جملہ معترضہ کے بیسویں واقعات اس کے شاہد عدل ہیں اور بہت ہی لطف آمیز۔ جملہ معترضہ کے طور پر ایک واقعہ اس وقت شیخ صاحب کی علوِ شان، مدرسہ کی مصالح کو اپنی مصالح پر مقدم کرنے کا لکھواتا ہوں۔

سہارنپور میں جمعیۃ العلماء کا مشہور و معروف اجلاس ۴۵ھ ہونے والا تھا، تین دن کا اجلاس تھا۔ میں نے حضرت ناظم صاحب سے کہا کہ جمعیۃ کے اجلاس کے دنوں میں مدرسہ میں تین دن کی چھٹی ہوگی۔ حضرت ناظم نے غصے سے فرمایا ''یہ کیسے ہو سکے گا؟ آج جمعیۃ کے واسطے چھٹی کر دیں، کل کو لیگ والے کریں گے اس میں بھی چھٹی کرنی پڑے گی،

پھر احرار، کانگریس، یہ تو روز کی بھرمار ہے۔ اور مدرسہ کا تعامل بھی ان اجلاسوں میں چھٹی کا نہیں، یہ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔'' بڑی مدلل تقریر فرمائی۔ میں نے ساری سن کر پھر کہہ دیا کہ ''جمعیۃ کے اجلاس کے درمیان مدرسہ میں چھٹی ہوگی۔'' ناظم صاحب کو غصہ آ گیا، مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے کہا، وہ حضرت تھانویؒ کے اجل خلفاء میں تھے، انہوں نے اور بھی زیادہ شدت سے انکار کیا کہ ''چھٹی ہرگز نہیں ہوگی۔'' اتفاق سے شیخ رشید احمد صاحب آ گئے حضرت ناظم صاحب نے بہت تعجب سے میری شکایت شیخ جی سے کی اور کہا کہ یہ تو روز کے قصے ہیں، جو مضمون اوپر گزرا۔

شیخ صاحب کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، بڑے ہی سمجھ دار تھے، اور اس سے بڑھ کر کمال یہ تھا کہ مدرسہ کی مصالح اپنے جذبات پر ہمیشہ مقدم سمجھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''چھٹی ضرور کرنی ہے، اور ہم سے اجازت ہرگز نہ لینا، ہم لوگ اس چھٹی کی بہت مخالفت کریں گے، بالخصوص حضرت تھانوی کے انکار کے بعد آپ کو چھٹی کرنی مشکل ہو جائے گی، اور چھٹی کرنی ضروری ہے، بہت سے بہت یہ ہوگا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات پیش آئی تو میں اعتراض کروں گا کہ آپ نے ہماری بغیر منظوری کیسے کر دی؟ آپ لکھ دیجئے گا کہ عین وقت پر شیخ الحدیث صاحب وغیرہ کی رائے یہی ہوئی، اس کی گنجائش نہ تھی کہ سرپرستان سے اجازت لی جائے، لہٰذا معاف فرماویں، آئندہ لحاظ رکھا جائے گا۔'' ناظم صاحب اور شیخ صاحب کی گفتگو میرے سامنے نہیں ہوئی لیکن اول شیخ جی مرحوم نے اور ان کے جانے کے بعد ناظم صاحب نے ایک ہی مضمون سنایا، اور ناظم صاحب نے مجھ سے تعجب سے فرمایا کہ ''شیخ جی تو دلی کی لیگ کے صدر ہیں، مسٹر جناح کے بڑے دوست ہیں وہ بھی تعجیت کی چھٹی کی تائید کر گئے ہیں۔'' میں نے عرض کیا ''حضرت بڑی کھلی ہوئی بات ہے، دیوبند میں ایک ہفتے کی چھٹی ہے، اور جلسہ لیگ، کانگریس کا نہیں جمعیۃ العلماء کا ہے، ایسی حالت میں مظاہر علوم سبق پڑھائیں، بہت مشکل ہوگا۔'' اس کے علاوہ شیخ صاحب کے اپنے جذبات کے خلاف مدرسہ کے مصالح کو مقدم رکھنے کے واقعات بہت ہیں۔

میرے اس خط پر جس کا نظامت کے دو ٹکڑوں کے متعلق اوپر ذکر آیا شیخ صاحب (اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرماوے) بہت غصہ آیا ان کا والا نامہ آیا کہ حکم نامہ بھیجئے ہم تو یہ سمجھے کہ سرپرست بھی آپ ہی ہیں ناظم بھی آپ ہی ہیں، جس سے جو کام لینا ہوا، حکم نامہ لکھ دیا، آپ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ اور میں نے مولانا عاشق الٰہی صاحب اور سر رحیم بخش صاحب کو لکھ دیا کہ یہ تجویز بعض مصالح کی بناء پر ابھی قابلِ عمل نہیں، آئندہ اجتماع

پر اس میں دوبارہ غور ہو جائے گا۔''

ان سب باتوں کے باوجود معلوم نہیں اس سیہ کار کے متعلق بعض احمقوں کو یہ خیال کیوں ہوتا تھا کہ میں نظامت پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بات ضرور تھی کہ مدرسہ میں خواص اور صاحبزادوں کے خلاف میرا ہاتھ زیادہ چلتا تھا۔ اور اس میں بھی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب، قاری سعید صاحب مرحوم مجھ کو زیادہ ابھارتے تھے، بلکہ تقریباً مجبور کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بہت بڑے خاص بلکہ اخص الخواص نے مدرسہ میں ایک درخواست دی کہ مجھے فلاں حجرہ تنہا کو دے دیا جائے۔ اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب ان کی خصوصیات کی بناء پر اس پر سفارش بھی لکھ دی، لیکن میرے پاس فوراً خود ہی آئے اور فرمایا کہ ''فلاں نے حجرہ کی درخواست دی اور میں نے سفارش بھی کر دی، مگر تنہا حجرہ مانگنے والے کے لئے نہایت مضر ہے ہی، مدرسہ کے لئے بھی مضر ہے۔'' میں نے کہا ''پھر آپ نے مضر سمجھنے کے باوجود سفارش کیوں کی؟'' فرمایا کہ ''مجبوری تھی، مگر آخر منظوری تمہاری ہی ہوگی، اس لئے جلدی اطلاع کرنے کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔'' حضرت ناظم صاحب کی خدمت میں جب وہ درخواست مع صدر مدرس صاحب کی سفارش کے پہنچی تو انہوں نے لکھ دیا کہ ''اگر شیخ الحدیث صاحب منظور کر لیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔'' میں نے انکار لکھ دیا۔ درخواست دینے والے کو اس ناکارہ پر جتنا بھی غصہ آئے وہ معذور ہے کہ صدر مدرس صاحب نے سفارش لکھ دی، ناظم صاحب نے منظوری دے دی اور میں نے انکار لکھ دیا۔

اس قسم کے قصے تقریباً روزانہ ہی پیش آتے تھے، اس وجہ سے خواص اکثر مجھ سے خفا رہتے اور ان کی خفگی بالکل برمحل تھی۔ حضرت ناظم صاحب کے خواص، مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے خواص اور دونوں سے بڑھ کر میرے حضرت قدس سرہٗ کے خواص، ان لوگوں کے خلاف میرا ہی ہاتھ زیادہ چلا کرتا تھا، اسلئے ان خواص کا مجھ سے ناراض رہنا یا ہونا، بالکل برمحل تھا۔

اخبار مدینہ کا غلط الزام

۵۷ھ میں اخبار مدینہ کے ایڈیٹر بزمی صاحب مرحوم کے ایک عزیز مدرسہ میں پڑھتے تھے، انہوں نے چند خواص کی جن کی ناراضگی مجھ سے برمحل اور فطری تھی، میرے خلاف شکایت لکھ کر اور لکھوا کر اخبار مدینہ کے دفتر میں بھیج دی، ایڈیٹر مرحوم کو کیا خبر؟ انہوں نے مختلف خطوط ایک شخص کے خلاف شکایات کے دیکھے تو انہوں نے میرے خلاف اخبار

مدینہ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ مطابق ۹ جون ۳۸ء میں ایک مضمون بہت سخت لکھ دیا۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ نے جب اس کو پڑھا تو ایڈیٹر صاحب کو سخت خط لکھا کہ ''شیخ الحدیث صاحب کے خلاف آپ نے جو مضمون لکھا ہے، میں ان سے اس وقت سے واقف ہوں جب کہ ان کی عمر بارہ برس کی تھی، اور اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، ان کے خلاف جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ بالکل غلط ہیں۔'' حضرت کے ارشاد میں اس واقعے کی طرف اشارہ ہے، جب کہ ۱۳۲۷ھ میں حضرت قدس سرہٗ کا دو ماہ مسلسل گنگوہ میں قیام رہا، اس وقت میری عمر بارہ برس کی تھی اور وہی میرا ابتدائی تعارف حضرت مدنی قدس سرہٗ سے ہے، اس کی تفصیل شاید کہیں آجائے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رئیس الاحرار نے مجھ سے بیان کیا کہ میں لاہور میں ہوٹل میں چائے پی رہا تھا، جب میں نے مدینہ کا یہ مضمون دیکھا میں نے ہوٹل ہی میں بیٹھے ہوئے ایک کارڈ ایڈیٹر صاحب کو لکھا کہ ''میں شیخ الحدیث صاحب سے اس وقت سے واقف ہوں جب ان کی طالب علمی کا آخری دور تھا، میں اس وقت سے انتہائی واقفیت کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ اطلاعات جو آپ کو دی گئی ہیں انتہائی غلط ہیں۔'' مولانا الحاج مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند اور حضرت شاہ یٰسین صاحب نگینویؒ کے خطوط کا تو مجھے علم ہے۔ سنا ہے کہ لکھے گئے بہت سے، لیکن ایڈیٹر مرحوم نے کسی اور کے خط کے جواب کی تو ضرورت نہیں سمجھی البتہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کو لکھا کہ میرے پاس اس کے خلاف شکایات کے خطوط کا انبار ہے آپ جب فرمائیں میں لے کر حاضر ہو جاؤں۔ حضرت نے لکھا، ''یہاں لانے کی ضرورت نہیں، فلاں تاریخ میری خالی ہے، میں اس تاریخ پر سہارنپور پہنچ جاؤں گا، آپ بھی مولانا مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ کو لے کر سہارنپور پہنچ جائیں۔'' اور ایک کارڈ سے حضرت نے مجھے بھی اطلاع فرمادی کہ ''میں ان لوگوں کے ساتھ فلاں تاریخ کو ان شکایات کی تحقیق کرنے آؤں گا جو فلاں اخبار میں چھاپی گئی ہیں۔'' میں نے اپنے سرپرستان کو بھی اس کی اطلاع کردی، حضرت میرٹھی کو تو ناگوار ہوا کہ سرپرستان سے مشورے کے بعد تاریخ مقرر ہونا چاہیے، لیکن شیخ رشید احمد صاحب کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے انہوں نے لکھا کہ شوق سے آئیں میں بھی اس تاریخ پر سہارنپور پہنچ جاؤں گا۔ معلوم نہیں رئیس الاحرار صاحب کو کس طرح اطلاع ہوئی کہ وہ بھی تاریخ سے ایک دن پہلے پہنچ گئے۔

۱۷ جولائی ۱۹۳۸ء مطابق ۱۸ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ کو یہ حضرات تشریف لے آئے اور صبح کے کھانے کے بعد سے لے کر دوپہر کو لیٹے بھی نہیں، رات کے بارہ بجے تک

شا کی لوگوں کو ایک ایک کو بلایا جاتا، اور ان کے بیانات قلمبند کئے جاتے تھے، مغرب کے بعد تک ان کا سلسلہ رہا۔ اس ناکارہ کے خلاف تو ایک شکایت سب کی مشترک تھی کہ نظامت کو مفلوج کر رکھا ہے، اس پر قبضہ کر لیا ہے، ناظم صاحب ایک عضو معطل بن گئے ہیں لیکن جب وہ اس کے کچھ جزئیات اور ثبوت مانگتے تو شا کی چپ ہو جاتا۔ ایڈیٹر صاحب کہتے کہ ''حضرت سے مرعوب ہیں۔'' حضرت فرماتے ''پھر تحقیق کی کیا صورت؟'' بعض ملازمین اور بعض مدرسین کے متعلق بھی کچھ شکایات انہوں نے کیں جس کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا، مجھ سے کوئی چیز دریافت نہیں کی، البتہ حضرت ناظم صاحب قدس سرہٗ سے میرے متعلق سوال کیا گیا اور حضرت مدنی قدس سرہٗ نے بلند آواز سے جس کو دور والوں نے بھی سنا، یہ فرمایا ''یہ آپ کے شاگرد یہ کہتے ہیں کہ مولوی زکریا نے آپ کو بالکل مفلوج کر رکھا ہے، آپ کو عضو معطل بنا دیا ہے۔'' حضرت ناظم صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا ''بالکل غلط، بے بنیاد، یہ شیخ الحدیث صاحب میرے دستِ راست، ان کے مشوروں اور رہنمائی سے مجھے بڑی سہولتیں ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو مجھے بڑی دقت ہو، اور اگر یہ نظامت قبول کریں تو میں بڑی خوشی سے ان کے حق میں دستبردار ہوں۔'' حضرت مدنی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا'' اسے کہیں مدعی ست گواہ چست۔'' اس کے بعد جو فیصلہ لکھا وہ یہ تھا:

''مدینہ'' مورخہ ۹ جون ۳۸ء میں مدرسہ مظاہر علوم کے متعلق شکایات و نقائص کی جو تفصیل شائع ہوئی تھی ان کی ہم نے آج تحقیقات کی اور ہم اس امر کا اعتراف کرنے میں مسرت محسوس کرتے ہیں کہ یہ شکایتیں بے اصل اور بے بنیاد ہیں، مدرسہ کے اربابِ اہتمام کے تمام کاموں میں نیک نیتی اور دیانت داری بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ یہ حضرات مدرسہ کی اصلاح اور درستگی کے کاموں کی طرف ہمیشہ متوجہ رہیں گے اور جو چیزیں اصلاح طلب ہوں گی ان کی اصلاح میں کامل انہماک اور شفقت کا ثبوت دیں گے۔

ابوسعید بزمی، ایڈیٹر مدینہ ، ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ
محمد مجید حسن، مالک اخبار مدینہ ، حبیب الرحمٰن لدھیانوی، صدر احرار
رشید احمد عفی عنہ ، سرپرست مدرسہ

یہ تحریر ایڈیٹر ہی کے قلم کی تھی، آخر الفاظ بھی اس کے اصرار پر لکھے گئے، ورنہ حضرت قدس سرہٗ بعض الفاظ کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن ایڈیٹر کو اس پر حیرت اور غصہ اور قلق تھا کہ اس ناکارہ کے خلاف کوئی شکایت، جو خطوط کے انبار میں تھی نہ مل سکی، اور مجھے اس

کی خوشی تھی کہ میرے حضرت قدس سرہٗ نوراللہ مرقدہٗ کے خلاف ۱۳۲۰ھ میں جو طوفان اٹھا اس سال کی روئدادوں میں اس کا ذکر بھی ہے، وہ بھی ممبروں کے خلاف مدرسہ پر جبر و قبضہ کا تھا۔ ۱۳۰۸ھ سے لے کر ۱۳۲۰ھ تک ایک ہنگامہ مدرسہ کے خلاف مدرسہ کے اندر اور باہر قائم رہا جو اس وقت کی روائدادوں سے کچھ نہ کچھ مترشح ہوتا ہے، اگرچہ حضرت قدس سرہٗ ۱۳۰۸ھ میں مدرسہ میں نہیں تھے، بلکہ ۱۳۱۴ھ میں آئے تھے، مگر اس فتنہ کی ابتداء ۱۳۰۸ھ سے ہی شروع ہوگئی تھی۔

۱۳۲۰ھ سے حضرت قدس سرہٗ کی برکات سے جو مدرسہ میں روحانی اور مادی ہر نوع کی ترقیات ہوئی ہیں وہ آج دنیا کے سامنے ہیں۔ اللہ کی شان، اللہ کے کاموں کی حکمت کون پہچان سکتا ہے، شاید ﴿الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ﴾ کا مظہر ہو۔

دارالعلوم دیوبند میں بھی ۱۳۰۴ھ سے لے کر ۱۳۱۸ھ تک اندرونی، بیرونی خلفشار کثرت سے ہوتا رہا، جس کی طرف اجمالاً حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے نقشِ حیات ص ۱۲۳ میں اشارہ بھی فرمایا ہے۔ اور تذکرۃ الخلیل (ص ۳۷۱ طبع جدید) میں بھی اس کا کچھ مختصر حال ہے۔ اسی زمانے میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ اور نواب چھتاری صاحب کو خلفشار مٹانے کے واسطے دیوبند تشریف لانا پڑا۔ اس زمانے کا ایک مکتوب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا اپنے دستِ مبارک کا لکھا ہوا، جس کا فوٹو تذکرۃ الرشید جلد دوم کے ختم پر چھپا ہوا ہے، جس کی عبارت یہ ہے:

از بندہ رشید احمد عفی عنہ

برادرانِ مکرّمانِ بندہ، مولوی محمود حسن و مولوی خلیل احمد صاحب مدفیوضہما! بعد سلام مسنون، مطالعہ فرمائیں

آپ دونوں کے چند خطوط پہنچے، جس سے وہاں کا حال معلوم ہوتا رہا۔ آج مولوی خلیل احمد صاحب کا خط آیا، جس سے پریشانی مدرسین کی دریافت ہوئی، لہٰذا یہ تحریر ضروری ہوئی۔

میرے پیارے دوستو! تم کو کیوں اضطراب و پریشانی ہے؟ تم تو ﴿وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ﴾ پر قانع رہو اور مدرسہ سے آپ کو فقط اتنا تعلق ہے کہ درس دیئے جاؤ۔ اگر مدرسہ بند حق تعالیٰ کرادے گا تم اپنے گھر بیٹھ رہنا، اگر مفتوح رہا درس میں مشغول رہنا۔ جو تم سے درس کرانا اہلِ شہر کو منظور نہ ہوگا تو دوسرا باب مفتوح ہو جائے گا، تم کس

واسطے پریشان ہوتے ہو، خبر بھی مت ہو کہ کیا ہو رہا ہے، اپنا کام کئے جاؤ۔ تمہارے برابر تو کسی کے دست و پا نہیں چلتے، تم کیوں بے دست و پا اپنے آپ کو لکھتے ہو؟ جس کام کے تم ہو اس میں تکرار نہیں۔ اب فقط نزاع یہی ہے کہ اہلِ شوریٰ کی زیادت ہو، تمہارا کیا حرج ہے، تم اپنا کام کرو۔ حاجی صاحب مصلحت کا کام کرتے ہیں وہ اپنی تدبیر میں رہیں۔ خواہ کچھ ہو ہماری تمہاری مرضی کے موافق ہو یا مخالف، اور اہلِ شوریٰ خود سب اختیار حاجی صاحب کو دے کر مطمئن ہو گئے، تم پر کیا بار ہے؟ پس تم جیسے لوگوں سے تردّد کا ہونا بے موقع ہے، تم کسی امر میں لَب کشامت ہو، کوئی پوچھے تو جواب دو درس کے بارے میں ہم سے پوچھو جو ہمارا کام ہے، انتظام وغیرہ کو نہ ہم جانیں نہ ہم دخل دیں اور اندیشۂ بد معاشاں بھی کچھ مت کرو۔ شعر حضرت شیخ المشائخ قدس سرہٗ کو مدِ نظر رکھو۔

قصد ظالم بسوئے کشتن ما — دلِ مظلوم ما بسوائے خدا
او دریں فکر تا بما چہ کند؟ — ما دریں فکر تا خدا چہ کند؟

اے عزیزاں! بروز اول مقدر ہو چکا ہے، ذرہ ذرہ جو واقع ہوگا۔ مدرسہ کے امور میں بھی وہی واقع ہوگا اور ہو کر رہے گا، خواہ کوئی دفع کرے یا واقع کرے، پھر تم کیوں سرگشتہ ہوتے ہو؟

؟ ہر چہ از محبوب رسد، شیریں بود

ہم کون ہیں؟ بے اختیارِ محض ہیں، اگرچہ بظاہر مختار ہیں، ہم پر جو گزرے گا وہ عین لطف ہوگا اور جو عالم میں صادر ہوگا وہ عین مصلحت ہوگا، خواہ خرابیٔ مدرسہ ہو یا بقا، خواہ عزت و نصب ہمارا تمہارا ہو، خواہ ذلت و عزل، تم یہ سب وقائع بازیگر کے سانگ سمجھ کر اپنے درس کے شغل میں بسر کرو، ایں و آں کو زید و عمر پر چھوڑو۔

ہر کس بخیال خویش خبطے دارد

نہ کوئی مفسد کا کچھ کر سکے نہ کوئی مصلح کر سکتا ہے، سب فاعلِ مختار کرتا ہے۔

﴿وما تشآئون إلا أن يشاء الله﴾

من از بیگانگان ہرگز نہ نالم — کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

﴿وهو ارحم الراحمين﴾ بس تمام ہوا قصہ وہاں کی خبر کا مشتاق ہوں، بشر ہوں، اپنے دوستوں کا دعا گو، خیر طلب ہوں، تم کو کوئی گزند نہیں مطمئن رہو، نہ مدرسہ کہیں جا رہا ہے۔ ہر شخص کو اپنے اپنے خیال پر نازاں جان کر کالائے بد بریش خاوند کرو اور دم بخود ہو کر می نوش و مے ینوش و چیز سے مخروش۔ فقط

سب عزیزوں کو بعد سلام مسنون یہ ہی مضمون جان بخش بعد سلام مسنون فرمادیں، جو دوستاں اہل تدبیر ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مضمون شکر ورضا ان سے کہہ دیں اور جس کو چاہو سلام کہہ دینا۔

یہ وقت اور یہ خروش اہلِ فساد عین مصلحت ہے اس کا جس قدر غلغلہ ہوگا اسی قدر مفید ہوگا انجام خیر ہی خیر۔ واصب ودائم رہے گا۔

(.....رشید احمد.....)

جب مظاہر کا یہ ہنگامہ ختم ہوگیا تو ناظم صاحب کو اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن اور اکابر مدرسین کی خاص طور سے یہ رائے ہوئی کہ جن لوگوں نے جھوٹے الزامات مدرسہ پر لگائے اور وہ اب تک گمنام ہی چل رہے تھے اب کھل کر سامنے آگئے، ان کا اخراج اب بہت ضروری ہے۔ تین دن تک ان حضرات کا ان کے اخراج پر اصرار تھا، اور یہ ناکارہ شدت سے مخالفت کررہا تھا۔ حضرت ناظم صاحب اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب رحمہم اللہ نے یہ کہہ کر میری مخالفت کو نظر انداز کردیا کہ چونکہ اس میں ان کی ذات کا معاملہ ہے اس لئے ان کی رائے اس میں معتبر نہیں، ان میں ایک صاحب ایسے تھے جن کے بڑوں سے حضرت ناظم صاحب کے بڑے تعلقات تھے، اور وہ صاحب تھے جن کی وجہ سے حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کو دقت اٹھانا پڑتی۔ اس لئے میں بار بار عرض کرتا رہا کہ حضرت میں اپنی وجہ سے نہیں عرض کررہا، آپ حضرات کی وجہ سے عرض کررہا ہوں کہ آپ حضرات کو بڑی دقت اٹھانی پڑے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اخراج کے دوسرے ہی دن ناظم صاحب کی خدمت میں وہ صاحب آئے جن کے متعلق میں نے کہا تھا اور ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بہت صفائی سے بلا جھجک ان سے کہہ دیا کہ شیخ الحدیث صاحب سے بات کرلیجئے۔ وہ صاحب میرے پاس آئے، میں ان کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا اور سچ یہ ہے کہ اللہ مجھے معاف فرمائے کہ اس وقت ناظم صاحب پر بڑا غصہ آیا۔ مگر چونکہ یہ تقریباً روزمرہ کا قصہ ہوگیا تھا کہ حضرت ناظم صاحب، جھگڑوں میں ہمیشہ اس سیہ کار کو آگے کردیا کرتے تھے، یہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے حضرت ناظم صاحب نے حضرت مدنی قدس سرہٗ کے سامنے یہ الفاظ کہے تھے کہ ''اگر یہ نہ ہوں تو مجھے بڑی دقت ہو'' یہ بالکل صحیح کہا تھا۔ بہت سے مواقع پر اس کی نوبت آچکی تھی کہ میری رائے کے خلاف کوئی بات اکابر مدرسہ نے تجویز کردی اور میں سختی سے عرض کرتا رہا کہ فلاں مشکل پیش آئے گی، اور جب وہ مشکل پیش آتی تو یہ سب حضرات اسی سیہ کار کے سر تھوپ دیتے، کئی اہم واقعات اس نوع کے بھی موقع ہوا تو لکھواؤں گا۔

سہارنپور کی جامع مسجد میں لیگ کا جلسہ، پٹنہ میں لیگ کا اجلاس وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے مدرسہ کے موجودہ اکابر خوب واقف ہیں۔ اگرچہ نئی امت کے لئے یہ بالکل غیر معلوم۔ میں نے اشارہ لکھ دیا، نہ معلوم لکھوانے کی نوبت آئے یا نہ آئے۔

مگر یہ واقعہ ابھی تک بہت سے دوستوں کو معلوم ہے، اسی وجہ سے حضرت مولانا عبداللطیف صاحب قدس سرہٗ ناظم مدرسہ کا اس سیہ کار کے متعلق مشہور مقولہ تھا، وہ پچاس دفعہ کہا ہوگا کہ ''اس کی بات بے سمجھے مان لیا کرو، چھ مہینہ پہلے کی کہتا ہے''۔ میرے حضرت اقدس رائے پوری کا بھی اس قسم کا مقولہ میرے سلسلے میں بہت مشہور ہے۔

بہر حال جب وہ صاحب جن کے متعلق طلبہ کے اخراج کے سلسلے میں میں نے حضرت ناظم صاحب سے کہا تھا کہ وہ سب سے پہلے آپ کے پاس آئیں گے، وہ میرے پاس تشریف لائے اور آتے ہی مجھ سے یہ کہا کہ ان کے قصور میں تو کوئی انکار نہیں، لیکن اخراج میں نظر ثانی کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟ میں نے ان سے کہا کہ ''یہ اجتماعی مشورے سے طے ہوا ہے، اس میں انفرادی رائے نہ یہ ناکارہ کوئی دے سکتا ہے، نہ حضرت ناظم صاحب، آپ ایک درخواست حضرت ناظم صاحب کی خدمت میں پیش کر دیجئے، دوبارہ مشورہ میں نظر ثانی ہو سکتی ہے، انفراداً نہیں''۔ چنانچہ وہ درخواست دوبارہ شوریٰ میں آئی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تو پہلے ہی مخالف تھا، اب بھی میرے نزدیک کوئی بات نہیں گئی اس پر لکھ دیا جائے کہ ''فلاں صاحب کی سفارش سے اخراج ملتوی کر دیا جائے''۔ البتہ اس میں ایک اشکال ہوگا، وہ یہ کہ ہر اخراج پر اس سے زیادہ زوردار سفارش آسکتی ہے، اس لئے اور کوئی اچھا عنوان اختیار کر لیا جائے، لیکن وہ حضرات اخراج کے التواء پر راضی نہ ہوئے، اس لئے دوبارہ بھی یہی لکھا گیا کہ غور وخوض کے بعد بھی اس اخراج کے التواء کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مدرسہ کو بہت شدید نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اس کے بعد جن جن مشکلات کی طرف اس سیہ کار نے اشارہ کیا تھا وہ ساری پیش آئیں اور سب کی نگاہوں میں یہ سیہ کار ہی مطعون رہا کہ چونکہ اس کا قصہ تھا اس واسطے اس نے نکلوا دیا۔

واقعات تو اس سیہ کار کی پچپن سالہ مدرسی دور کے نہ معلوم کتنے ہیں، ان سب کا احصاء مشکل ہے، ہر باب میں نمونہ کے طور پر دو، چار لکھوا کر ختم کر دیا کرتا ہوں، اس لئے اس مضمون کو ختم کر کے تالیفات کی یادداشت لکھواتا ہوں کہ وہ بھی اہم ہے۔

اس باب کے شروع میں درس وتعلیم اور تالیفات تین مضمون تھے، اب یہ تیسرا مضمون ہے۔

تالیفات

لکھنے کی مشق تو بچپن ہی سے شروع ہوگئی تھی، گو خط تو اب تک اچھا نہ ہوا، مگر صحیح اور پختہ اتنا ہوگیا تھا کہ "بذل المجهود" کی تالیف کے زمانہ میں کئی مرتبہ حاسدین نے بذل کی کتاب اس بہانہ سے منتقل کرائی کہ فلاں صاحب بہت خوش خط لکھتے ہیں ان سے لکھوائی جائے۔ لیکن استاذ الکل منشی محبوب علی صاحب جنہوں نے بذل المجہود کی پہلی جلد لکھی اور وہ اس زمانے کے سارے ہی کاتبوں کے استاد یا استاد کے استاد تھے، اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، انہوں نے میرے حضرت قدس سرہٗ سے یوں کہا کہ حضرت! میرے لئے تو ان بد خط سے ہی نقل کرادیا کریں، ان کے شوشے اور نقطے بہت صحیح ہوتے ہیں، مجھ جیسے جاہل کے لئے ایسی تحریر زیادہ کارآمد ہے جس کے نقطے اور شوشے زیادہ صحیح ہوں خوشخط پڑی نہ ہو۔

بہر حال ابتداء تو تختی پر اب ت سے ہوئی، اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں بعد تختی پر قرآن شریف پڑھنے کے زمانے میں بہشتی زیور کی نقل شروع ہوئی اور اس کے بعد فارسی کی کتابوں کی نقل اور ترجمہ تختی پر شروع ہوا۔ اس کے بعد مستقل تالیف کا سلسلہ شروع ہوا جس میں سب سے پہلے ابا جان ایک دو لفظ بنا کر اور صَرف کے قواعد بتا کر یوں فرمایا کرتے تھے کہ "اس کے صیغے بناؤ"۔ اس زمانے میں اس کی مشق ایسی بڑھی کہ رات دن اسی سوچ میں گزرتا تھا، "بت" کے تیس چالیس صیغے بنانے تو اب بھی یاد ہیں اور اس کی کاپیاں بھی میرے کاغذات میں اب تک پڑی ہیں۔ جب دہلی جانا ہوتا تھا تو مظفر نگر سے اگلا اسٹیشن کھاتولی ہے دہلی تک اس کے صیغے بناتا جایا کرتا تھا۔

اس دور کے بعد پھر ادب کا ذوق شروع ہوا تو سہارنپور سے دہلی تک اشعار کا دور تھا۔ کھڑکی سے منہ باہر نکال کر شعر پڑھتا جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد قرآن پاک کا دور شروع ہوا۔ سہارنپور سے دہلی تک ۱۵ اور ۲۰ تک کے درمیان میں پاروں کا ہمیشہ معمول رہا۔ اس زمانہ میں ریل کے سفر بذل کی طباعت کی وجہ سے بہت کثرت سے ہوا کرتے تھے۔

۱) شرح الفیہ اردو غیر مطبوع:

درس کے دوسرے سال میں جب الفیہ شروع کیا تو ساتھ ساتھ اس کی اردو شرح بھی شروع کی، جو کل تین جلدوں میں پوری ہوئی۔ پہلا جزء بہت مفصل شرح کے طور پر، اس کے بعد مختصر ہوتی چلی گئی اور ۱۸/ شعبان ۲۹ھ۔ پنجشنبہ کو پوری ہوئی۔ اس کا مسودہ الماری میں موجود ہے۔

(۳) اردو شرح سلم غیر مطبوع:

جس سال میں سلم پڑھی یعنی ۳۲ھ میں حضرت مولانا عبدالوحید صاحبؒ بہت طویل تقریر فرماتے تھے اور میں سبق کے ساتھ پنسل سے لکھا کرتا تھا اور سبق کے بعد صاف کیا کرتا تھا۔

یہ دونوں مسودے چند سال ہوئے تو پورے تھے، اب چند سال سے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

(۳) اضافہ بر اشکال اقلیدس غیر مطبوع:

۳۲ھ میں جب اقلیدس پڑھی تو کچھ اس وقت ایسا مزہ آیا کہ اس کے قواعد پر اپنی طرف سے شکلیں گھڑا کرتا تھا۔ اس کی کاپیاں اضافہ بر اشکال اقلیدس کے نام سے اب تک محفوظ ہیں۔

(٤) تقریرِ مشکوٰۃ غیر مطبوع:

ابتداءِ زمانہ طالب علمی میں پڑھنے کے زمانہ میں بہت مختصر لکھی تھی۔ پھر شوال ۴۱ھ میں پہلی دفعہ مشکوٰۃ پڑھانی شروع کی تو اس کو سامنے رکھ کر اور حواشی کی مدد سے دوبارہ لکھی یہ تقریر طبع تو نہیں ہوئی مگر شاید سو سے زائد نقلیں طلباء و مدرسین لے جا چکے ہیں

(۵) تقاریر کتب حدیث غیر مطبوع:

اس ناکارہ نے کتبِ صحاح اولاً اپنے والد صاحب سے پڑھیں، ثانیاً حضرت قدس سرہٗ سے۔ ہر شیخ کی درس کی تقریروں کی نقل کا اہتمام تھا، مگر مکمل اور مرتب نہیں۔ البتہ حضرت قدس سرہٗ کی نسائی شریف کی تقریر مختصر مکمل میری تالیف کی الماری میں ہے۔ مجھے خوب یاد ہے میرے حضرت قدس سرہٗ اگر کوئی حرف ایسا فرماتے تھے جو بین السطور میں ہو اس کو بھی نقل کر لیتا تھا، یہ سمجھ کر کہ میرے حضرت کا فرمایا ہوا ہے۔

(٦) مشائخ چشتیہ غیر مطبوع:

(۷) احوالِ مظاہر علوم غیر مطبوع:

جب یہ ناکارہ پڑھنے سے فارغ ہو گیا تو ۳۵ھ مدرسی کے ابتدائی دور میں دو رسالے لکھنے شروع کئے تھے، ایک اولاً مشائخ چشتیہ، جس میں اپنے شیخ قدس سرہٗ سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جملہ مشائخ کے حالات تبرکاً لکھنا شروع کئے تھے، اکثروں کے

پورے ہو گئے اور بعض کے پورے نہیں ہوئے۔

اسی طرح نظرِ براداء حقوق مظاہر علوم، اس کے پچاس سالہ حالات ابتداء بناء سے ۳۴ھ تک سنہ وار۔ ۱ بنائی مطابق ۱۳۸۳ھ ہر سال کی آمد وخرچ کی میزان، فارغ التحصیل لوگوں کی تعداد، اور تقرر، علیحدگی، ملازمین اور متفرق حالات، یہ بھی تقریباً حصہ اول تو پورا ہو گیا اور مدرسہ کے اکثر حالات جو مدرسہ کی روئدادوں وغیرہ اور اشتہاروں میں چھپے ہیں۔ وہ ۳۵ھ کے بعد سے اسی سے لئے گئے ہیں۔ ارادہ یہ تھا کہ دوسرے حصے میں ان سب اکابر کے مختصر حالات بھی لکھوں گا لیکن مدرسی کے اسباق کے علاوہ بذل کی مشغولیت بھی بڑھتی گئی۔ اس لئے یہ دونوں رسالے باوجود بہت بڑی مقدار میں ہو جانے کے ناقص ہی ہیں، اور اب تو تکمیل کی کوئی صورت بھی نہیں۔

(۸) تلخیص البذل غیر مطبوع:

ربیع الاول ۳۵ھ جب سے بذل المجہود شروع ہوئی تھی اس ناکارہ کا معمول یہ رہا کہ حضرت قدس سرہٗ کے اٹھنے کے بعد سے لے کر اس دن کے لکھے کا ایک خلاصہ ساتھ ساتھ لکھتا رہتا تھا جس میں ابحاثِ طویلہ کے خلاصوں کو اپنی عبارت میں اپنی یادداشت کے واسطے نقل کر دیا کرتا تھا۔ یہ بھی تقریباً سب جلدوں کے ساتھ ساتھ ہوتی رہی۔ اسانید سے تو بحث نہیں کرتا تھا۔ الّا یہ کہ کسی خاص سند پر کوئی بحث کرنی ہو۔

(۹) شذرات الحدیث غیر مطبوع:

ناکارہ کا معمول یہ رہا کہ بذل کے لکھنے کے زمانے میں شروع بخاری وغیرہ میں جب کسی دوسری کتاب کے متعلق کوئی مضمون نظر سے گزرتا تو میں نے ہر کتاب کی ایک کاپی بنا رکھی تھی اور اس کتاب کے نام سے اس کاپی پر نا لکھتا تھا: ''شیخ'' (شذرات بخاری) اسی طرح شم، شت، شد وغیرہ۔ صحاح ستہ کی ہر کتاب اور مؤطائین اور طحاوی اور ہدایہ کی کاپیاں بنا رکھی تھیں۔ اس کو تفصیل سے اس واسطے لکھوا رہا ہوں کہ میری مطبوعہ تالیفات میں ''کذا فی الشذر والبسط فی الشذر'' کے حوالے کہیں کہیں آ گئے ہیں۔

اس ناکارہ کی بذل کی تالیف کے زمانہ میں اس کی بہت خواہش رہا کرتی تھی کہ کوئی شخص حضرت سے دو چار منٹ کو بات کرنے کے واسطے آ جائے تو میں جلدی جلدی وہ لکھے ہوئے مضامین شذرات کی کاپیوں پر لکھ لوں۔ اگرچہ حضرت قدس سرہٗ کو اس وقت میں کسی کا بات کرنا بہت ناگوار ہوتا تھا۔ جس کو میں خوب سمجھتا تھا، مگر میں اپنی غرض کو چاہتا تھا

کہ ایک دو منٹ کو کوئی آتا رہے۔ مجھے اس کا وقت صرف ڈاک کی آمد پر ملتا تھا کہ مدرسہ کی ڈاک اول حضرت قدس سرہٗ کے پاس آتی تھی، حضرت قدس سرہٗ اپنی ڈاک چھانٹ کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور میری میرے پاس ڈال دیتے تھے نہ تو حضرت اس وقت اپنی ڈاک پڑھتے تھے نہ یہ ناکارہ۔ البتہ اگر قلم سے یا مرسل کے نام سے کوئی اہم خط سمجھتے تو حضرت بھی سرسری دیکھ لیا کرتے تھے اور میں بھی۔

ایک لطیفہ اس جگہ کا بہت پر لطف یاد آ گیا۔ حضرت قدس سرہٗ کی اہلیہ کی طرف کے کوئی عزیز جو کسی جگہ تھانیدار تھے اور اس زمانے کا تھانیدار اس زمانے کا وائسرائے ہوتا تھا۔ نہایت لیحم شحیم، وجیہ، تھانیداری سوٹ میں ملبوس آئے۔ میرا منہ چونکہ دروازے کی طرف ہوتا تھا اور حضرت قدس سرہٗ کی پشت، اس لئے میں ان کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا، اس لئے کہ میرے کئی شذرات جمع ہو رہے تھے اور مجھے یہ فکر ہو رہی تھی کہ کہیں میں بھول نہ جاؤں۔ انہوں نے آ کر حضرت قدس سرہٗ کو پشت کی طرف سے سلام کیا اور حضرت ادھر متوجہ ہوئے اور میں نے بذل کی کاپی ہاتھ سے رکھ کر جلد ہی سے اپنے شذرات اٹھا لئے۔ ہمارے مدرسہ کے ناظم کتب خانہ بھائی مظہر صاحب جو ابتدائی زمانہ میں میرے شریک درس بھی رہ چکے تھے، ان تھانیدار صاحب کے بہت قریب کے رشتہ دار تھے، وہ ساتھ تھے۔ چند منٹ وہ بیٹھے اور حضرت بڑی گرانی سے ان سے باتیں کرتے رہے اور میں نے جلدی جلدی اپنے شذرات پورے کئے۔ جب وہ واپس چلے گئے اور حضرت ادھر متوجہ ہوئے، میں نے بذل لکھنی شروع کر دی۔ وہ صاحب کے اٹھنے کے بعد مجھ پر بہت ہی ناراض ہوئے۔ باہر جا کر بھائی مظہر سے کہا کہ بزرگوں کے پاس بیٹھنے والوں کے بھی اخلاق ایسے خراب ہوا کرتے ہیں۔ یہ شخص جو حضرت کے پاس بیٹھا ہوا ہے اس قدر مغرور اور متکبر ہے کہ ”میں اتنی دیر بیٹھا رہا اور حضرت اس قدر شفقت سے مجھ سے باتیں کرتے رہے، لیکن اس مغرور اور بد دماغ نے ایک دفعہ بھی تو نگاہ اٹھا کر یوں نہیں دیکھا کہ یہ آدمی بیٹھا ہے، گدھا بیٹھا ہے، کتا بیٹھا ہے، سور بیٹھا ہے۔“ بھائی مظہر نے اس ناکارہ کی طرف سے بہت صفائی پیش کی کہ ”یہ بات نہیں بلکہ یہ مشغول بہت رہتا ہے۔“ لیکن ان کے دماغ میں یہ بات نہیں آ سکی کہ ایسی بھی مشغولیت ہو سکتی ہے۔ وہ دیر تک خفا ہی ہوتے رہے۔ ان کی خفگی بجا تھی کہ ناواقف آدمی کو یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ اس قسم کی مشغولیت بھی ہو سکتی ہے اور اس ناکارہ کا وہ زمانہ درحقیقت طلب علم کا تھا۔ بسا اوقات رات دن میں ڈھائی تین گھنٹے سے زیادہ سونا نہیں ہوتا تھا، اور بلا مبالغہ کئی مرتبہ بلکہ بہت سی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ روٹی کھانی یاد نہیں رہی کہ مہمانوں کا ہجوم اس زمانے میں میرے پاس نہیں ہوتا تھا۔

البتہ طلبہ ساتھ کھانے والے ہوتے تھے، ان سے کہہ دیا تھا کہ تم کھالو میرا انتظار نہ کرو۔ عصر کے وقت جب ضعف معلوم ہوتا تھا اس وقت یاد آتا کہ دوپہر روٹی نہیں کھائی، اور رات کو کھانے کا معمول تو اس سے پہلے چھوٹ گیا تھا تیس پینتیس گھنٹے روٹی کھائے ہوئے گزر جاتے تھے۔

۷- جُزء حَجّة الوَداع والعمرات .....مطبوع:

جب میں پہلی دفعہ مشکوٰۃ پڑھا رہا تھا جو شوال ۴۱ھ میں شروع ہوئی تھی تو ۲۲ ربیع الاول شب جمعہ ۱۲ بجے لکھنا شروع کیا تھا اور ایک دن ڈیڑھ رات میں شنبہ کی صبح کو پورا کر دیا تھا۔ اب تو مشائخ اکابر دیکھ کر تعجب فرماتے ہیں کہ ایک دن ڈیڑھ رات میں تو اس کی نقل بھی مشکل ہے۔ ہر سال یہ ناکارہ اور دیگر مدرسین جب کسی حدیث کی کتاب کی کتاب الحج پڑھاتے تھے تو دو چار دن اسکو مانگ لیتے تھے۔ متعدد اکابر مدرسین کے پاس اس کی نقلیں بھی تھیں، مگر طبع کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا، بلکہ بعض لوگوں نے جب طباعت کی فرمائش کی تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ تو یادداشتیں ہیں، طباعت کا ارادہ نہیں۔

لیکن گزشتہ سال مدینہ منورہ میں شعبان ۸۹ھ میں دفعۃً اس کی طباعت کا خیال پیدا ہوا اور آخر ذیعقدہ ۸۹ھ میں اس رسالہ کا سننا شروع کیا۔ نزولِ آب کی وجہ سے آنکھیں بے کار تھیں، اس لئے عزیزان مولوی عاقل، مولوی سلمان نے سنانا اور صاف کرنا شروع کیا اور ۲۶ ربیع الثانی ۹۰ھ پنجشنبہ اس کی تبییض پوری ہوئی، اور اس کے چند روز بعد میں نے خواب میں دیکھا، کسی شخص نے مجھ سے یہ کہا کہ ''اس کی تکمیل حضور کے عمروں کے بیان کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اس لئے ۱۷ جمادی الاولیٰ ۹۰ھ بروز بدھ ''جزء العمرات'' کی تالیف شروع ہوئی اور ۱۵ رجب ۹۰ھ یوم جمعہ کو ختم ہوگئی اور شعبان ۹۰ھ میں پہلی طباعت لیتھو میں ہوئی اور اسی وقت دوسری طباعت ندوہ لکھنو میں ٹائپ پر شروع ہوگئی۔

۸- خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی .....مطبوع:

بذل کی طباعت کے لئے بار بار دہلی جانا ہوتا تھا۔ ہر پندرہ بیس دن میں ایک دو شب کو جانا ہوتا تھا، رات کو گاڑی ایک بجے رات سہارنپور سے چلتی تھی اور جب تک بذل کی طباعت کا سلسلہ رہا یہ گاڑی بدستور رہی اور دو یا تین دن دہلی میں قیام رہتا تھا، پروفوں کے دیکھنے کے بعد جتنا وقت بچتا اس میں اس کو لکھا کرتا تھا۔ ۴۳ھ میں اس کی تالیف شروع ہوئی تھی اور ۸ جمادی الثانی ۴۴ھ شبِ جمعہ میں پوری ہوئی، اس کی تالیف دریبہ کلاں کی مسجد میں ہوئی کہ وہیں دن بھر میرا قیام ہوتا تھا اور جب واپس آتا تو اس کے سارے کے

سارے کاغذات ایک صندوقچی میں بند کر کے حاجی عثمان خان صاحب مرحوم کی دکان پر رکھ آتا۔ خصائل کے شروع میں اس کا مختصر حال لکھا جا چکا ہے اور متعدد مرتبہ طباعت کے بعد ۶۰ھ میں اس میں اضافہ ہوا۔

۱۲- حواشی بذل المجہود ..... غیر مطبوع:

بذل المجہود کی طباعت کے بعد سے اس پر حواشی کا سلسلہ اس ناکارہ کی طرف سے شروع ہوا۔ اور اخیر زمانہ تک یعنی ۸۸ھ تک ابوداؤد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں جو نئی بات نظر پڑتی رہی، وہ بذل کے حاشیہ پر لکھتا رہا، وہ ایک مستقل ذخیرہ بن گیا۔

۱۳- تحفة الاخوان ..... مطبوع:

۱۴- شرح عربی جزری .....غیر مطبوع:

۱۵- رسالہ در احوال قراء سبعہ - البدور مع نجوم ہم الاربعة عشر .....غیر مطبوع:

۴۵ھ میں جب یہ سیہ کار مدینہ پاک ایک سالہ قیام کی نیت سے گیا اور وہاں کچھ تجوید پڑھنے کا شوق ہوا، اور المقرئ الشہیر استاذ الاساتذہ القاری حسن شاعر جو اس زمانہ میں بھی معمر تھے اور مکہ اور مدینہ کے قراء کے مشہور استاد تھے، بڑا شہرہ ان کا تھا، ان سے شاطبی شروع کی، لیکن پہلے ہی سبق میں ان سے لڑائی ہوگئی، اس لئے کہ حضرت قاری صاحب نے یوں فرمایا کہ ''مطلب سمجھنے کی ضرورت نہیں، اشعار حفظ یاد کرلو۔'' اس ناکارہ نے عرض کیا اشعار تو ضرور حفظ کر کے سنایا کروں گا، مگر اتنے مطلب نہ سمجھوں اتنے قرآن کے الفاظ کی طرح سے اس کے اشعار کو یاد کرنے سے کیا فائدہ؟ میرے حضرت قدس سرہٗ کو کئی ماہ بعد اس قصہ کی خبر ہوئی تو حضرت نے ارشاد فرمایا ''تو نے مجھ سے نہ کہا شاطبی تو تجھے سمجھا کے میں پڑھاتا قاری صاحب کی شاگردی تو اسی دن ختم ہوگئی تھی، لیکن ان کی شفقت و محبت اب تک بھی رہی، چنانچہ گزشتہ سال ۸۹ھ میں جب مدینہ پاک حاضری ہوئی اس وقت بھی وہ زندہ تھے اور بہت ہی ضعیف، بہت ہی معمر، خبر سنتے ہی دو آدمیوں کے سہارے تشریف لائے۔ اور ہر مجلس میں اس ناکارہ کے متعلق، سید محمود کے یہاں اور بڑوں بڑوں کے یہاں بہت فخر سے فرماتے رہے کہ یہ میرا تلمیذ رشید ہے، اور ہمیشہ اسی لفظ سے تعارف کرایا کرتے۔ اور میں ان کے ''رشید'' کہنے پر اس قدر شرمندہ ہوتا ہوں کہ نالائق سے لڑائی تو پہلے ہی دن ہوگئی تھی، پھر بھی

میں رشید ہی رہا۔ لیکن ان کی شفقت اس سال بھی بہت رہی۔ ''تحفۃ الاخوان فی بیانِ احکامِ تجوید القرآن'' ان کی عربی تالیف ہے، وہ چونکہ اردو سے واقف نہیں تھے اور ان کے ہندی شاگرد بہت کثرت سے ہر سال ان سے چند روزہ قیام میں بھی کچھ نہ کچھ ان کی عام شہرت کی وجہ سے ان سے پڑھتے تھے، اس لئے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ اس کا اردو ترجمہ لکھوں، وہ میں نے ایک دو دن میں کر دیا، اور ۸ جمادی الاولیٰ ۴۵ھ کی تاریخ اس کے خاتمہ پر لکھی ہوئی ہے۔ اس کے متعلق ایک بڑا لطیفہ بھی پیش آیا، جو عنقریب لکھوں گا، اور بھائی الحاج احمد علی صاحب راجپوری مہاجر مدینہ منورہ کی مساعی جمیلہ سے یہ ان کی حیات تک پندرہ بیس دفعہ چھپا، ان کی وفات کے بعد کا حال معلوم نہیں۔ لیکن مظاہر علوم کے کتب خانہ میں اس کا مطبوعہ ایک نسخہ تو یقیناً ہے جس کے متعلق بارہا لوگوں نے مجھے بتایا، زائد کی مجھے خبر نہیں۔

دوسرا رسالہ ''شرح عربی جزری'' غیر مطبوع بھی قاری صاحب موصوف کے تعمیل حکم میں عربی طلبہ کے واسطے لکھی تھی، اس کی طباعت کا حال مجھے معلوم نہیں، البتہ اس کی نقل میرے ساتھ ہندوستان بھی آئی تھی، جو میرے مسودات میں ہے۔

تیسرا رسالہ ''در احوال قراء سبعہ'' بھی مدینہ پاک کے قیام میں لکھا، جس میں قراء سبعہ اور ان کے چودہ شاگردوں کے مختصر احوال لکھے تھے، یہ اپنے شوق سے لکھا تھا کہ رسائل کے لکھنے کے بعد جو وقت بچتا وہ علمی ذوق کی وجہ سے ان ہی میں خرچ ہوتا۔ بالخصوص رات کا وقت کہ مسجد نبوی کے تو کواڑ لگ جاتے، اور جلدی سونے کی کبھی عادت نہیں پڑی۔ کتابت کی چیزیں تبرکاً تھوڑی تھوڑی نقل کر کے بھی لایا تھا، جس میں معجم کبیر، اوسط اور شرح معانی الآثار للطحاوی، جواب بحمد اللہ مولوی یوسفؒ کی مساعی جمیلہ سے مدرسہ میں پوری کا عکس آ گیا ہے۔ یہ مصر سے وہاں کے قیام میں نہایت حسین نہایت خوبصورت گیارہ جز گیارہ اشرفیوں میں نقل کرائے تھے، مگر افسوس! یہاں آنے کے بعد جلدی ہی دو بزرگوں کی کشمکش سے کھوئی گئی کہ وہ دونوں حضرات اس کے مشتاق تھے، اور بار بار ایک دوسرے سے منگاتے تھے، میں تو مطمئن رہا کہ ان دونوں میں سے کسی کے پاس ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں کسی تیسرے کو پسند آ گئی۔

جس لطیفہ کا اوپر ذکر ہوا وہ یہ ہے:

حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کا دستور یہ تھا کہ اگر مجمع زیادہ ہوتا تب تو کھانا دسترخوان شریف میں آتا، لیکن ہم خدام میں سے اگر دو چار ہوتے تو حضرت قدس سرہٗ مکان ہی پر بھیج دیتے، اور ہر دو اہلیہ میں سے جونسی اہلیہ کا نمبر ہوتا ان کے مکان پر کھانا کھانے کی نوبت آتی

البتہ چھوٹی محترمہ کے یہاں کھانا کھانے کی زیادہ نوبت آئی، ایک مرتبہ چھوٹی اہلیہ کے زنانہ مکان پر چھت پر یہ ناکارہ اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ صرف ہم دو کھانے میں تھے، اور حضرت قدس سرہٗ خود بنفسِ نفیس اندر سے کھانا لا رہے تھے، جس کی بڑی شرم آرہی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ ہاتھ میں دوربین لئے ہوئے اندر سے تشریف لا رہے، مستورات بھی قریب ہی کمرہ میں تھیں اور ہم صحن میں کھانا کھانے بیٹھے تھے، حضرت اندر سے بہت ہی ہنستے ہوئے تشریف لائے، وہ منظر بھی بہت آنکھوں میں کانوں میں اور دل میں گونج رہا ہے، حضرت نے فرمایا ''مولانا زکریا صاحب آج ایک عجیب بات معلوم ہوئی کہ آپ قاری بھی ہیں،'' میں نے عرض کیا ''حضرت بالکل نہیں، میں تو فارسی میں قرآن پڑھوں'' حضرت نے فرمایا ''مجھے بھی یہی معلوم تھا کہ آپ قاری نہیں ہیں، مگر یہ عورتیں بہت ساری جمع ہیں اور متفق اللسان اس پر اصرار کررہی ہیں کہ آپ قاری ہیں اور آپ سے قرآن سننے کی میرے واسطے سے باصرار درخواست کررہی ہیں''۔ مجھے معلوم تھا کہ بھائی احمد علی اس سال مع اہلیہ آئے ہوئے ہیں میں نے پوچھا کہ ''حضرت! بھائی احمد علی صاحب کی اہلیہ تو ان میں نہیں؟'' حضرت نے فرمایا ''کیسے سمجھا؟ وہ تو ہیں''۔ میں نے عرض کیا کہ ''تو روایت صحیح ہے''۔ اور پھر میں نے تحفۃ الاخوان اور شرح جزری کا سارا قصہ سنایا اور میں نے کہا کہ ''حضرت! میں مدینہ میں تو قاری ہوں، ہندوستان میں نہیں''۔

(۱۶) اوجز المسالک شرح موطا امام مالک ۶ جلد (مطبوع)

تالیف کا سلسلہ اور چسکہ تو ۳۵ھ سے بڑھتا ہی گیا ۴۵ھ میں مدینہ پاک میں جب بذل المجہود قریب الختم ہوئی اور یہ خیال تو طے شدہ تھا کہ حدیث پاک کا ہی مشغلہ رکھنا ہے، اگرچہ حدیث کے اسباق مدرسہ میں شروع ہوگئے تھے، پھر بھی تالیفی ذوق تو تھا ہی، مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ بذل کے بعد کوئی کتاب لکھنے کے لئے سوچنی چاہیے، میرے ذہن میں بہت مختصر مؤطا امام مالک آئی اور مدینہ پاک کی مناسبت سے موطا امام مالکؒ کی شرح ''اوجز المسالک'' کے نام سے غرۂ ربیع الاول ۴۵ھ کو اقدام عالیہ میں بیٹھ کر بسم اللہ لکھی اور بذل کے ختم ہونے تک تو دو چار سطریں لکھی جاتی تھیں اور بذل کے ختم کے بعد ۲۱ شعبان ۴۵ھ سے مدینہ پاک سے روانگی تک تقریباً تقریباً ڈیڑھ جلد کا مسودہ ہوگیا، لیکن ہندوستان واپسی کے بعد مشاغل کا ایسا ہجوم رہا اور اس کے درمیان میں دوسری تصانیف کا بھی سلسلہ رہا جیسا کہ آئندہ سالوں سے معلوم ہوجائے گا۔ تدریس کے علاوہ مدرسہ کے دوسرے مشاغل نے بھی بہت وقت لیا، اس لئے تیس سال سے زائد اس کی تالیف میں لگ گئے۔

میری سفر حجاز سے واپسی پر ۶۴ھ کے شروع میں میرے حضرت قدس سرہٗ کا ارشاد آیا

کہ بذل المجہود کی طرح میں ترمذی کی شرح لکھوں اور میرے ذہن میں یہ تھا کہ ایک آدھ سال میں اوجز ختم ہو جائے گی اس لئے کہ ڈیڑھ جلد اس کی مدینہ پاک میں دو تین مہینہ میں ختم ہو چکی تھی اور اس کے بعد میری خواہش طحاوی کی شرح لکھنے کی تھی، اس لئے کہ طحطاوی سے بہت بچپن سے محبت تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے طحاوی شریف کی شرح اردو لکھنی شروع کی تھی اور اس کا اشتہار بھی دے دیا تھا۔ بہر حال میں نے حضرت قدس سرہٗ کو لکھا کہ ''میرا خیال طحاوی پر کچھ لکھنے کا ہے، آئندہ جیسے ارشاد ہو''۔ حضرت قدس سرہٗ نے لکھا کہ ''طحاوی غیر متداول ہے اور ترمذی متداول ہے ہر مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کی زیادہ ضرورت ہے''۔ اسی خط و کتاب میں میرے حضرت قدس سرہٗ کا وصال ۱۵ ربیع الثانی ۳۶ھ میں ہو گیا، پھر میں نے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے مشورہ کیا کہ ترمذی میں شروع کروں یا اوجز پوری کروں؟ چچا جان کی رائے بھی ہوئی کہ وہ درمیان میں ہے، پہلے اس کو پوری کر لی جائے۔ حضرت قدس سرہٗ کی حیات میں تو ارادہ کر لیا تھا کہ فوراً مدینہ منورہ حاضر ہو جاؤں اور حضرت ہی سے ابتداء کراؤں اور بذل کی طرح جب تک حضرت کی حیات رہے حضرت لکھواتے رہیں اور لکھتا رہوں، لیکن اوجز نے جوانی کا سارا زمانہ لے لیا، اس کے بعد ہمت بھی کچھ قاصر ہو گئی اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کے شدید اصرار پر ''لامع'' شروع ہو گئی اور اس کے بعد '' عدہ نفسک فی الاموات'' میں داخل ہو گیا۔

(۱۷) فضائل قرآن (مطبوع)

حضرت شاہ یٰسین صاحب یکے از خلفاء قطب عالم گنگوہیؒ قدس سرہٗ جو ہر سال مظاہر علوم کے جلسے میں آیا کرتے تھے اور ۲۷ ذیعقدہ ۴۸ھ کے جلسہ کے موقع پر بہت زور سے اصرار فرما کر گئے ان کے تعمیل ارشاد میں اوائل ذی الحجہ میں شروع ہوئی اور ۲۹ھ کو ختم ہوئی۔ فضائل کا یہ پہلا رسالہ ہے جو حضرت شاہ صاحب کی تعمیل حکم میں لکھا گیا اور فضائل کا سب سے آخری رسالہ ''فضائل درود'' بھی شاہ صاحب کے ارشاد سے لکھا گیا۔

(۱۸) فضائل رمضان (مطبوع)

رمضان ۴۹ھ میں چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے تعمیل ارشاد میں نظام الدین لکھی گئی اور ۲۷ رمضان المبارک میں ختم ہوئی۔

(۱۹) قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم (مطبوع)

۴۹ھ میں جبریہ تعلیم کا بہت زور ہوا، جس کے خلاف حضرت حکیم الامت تھانوی

اور میرے چچا جان نور اللہ مرقد ہما نے بہت زیادہ مساعی جمیلہ فرمائیں۔ چچا جان نے اس ناکارہ کی وساطت سے حضرت مدنی قدس سرہٗ کی صدارت میں متعدد جلسے بھی کرائے۔ اس سلسلے میں بھی ایک لطیفہ ہے مگر طویل۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ ممبرانِ اسمبلی کے نام خطوط تحریر فرمایا کرتے تھے اسی سلسلے میں اس ناکارہ نے یہ ایک خط جو تقریباً ۳۲ صفحات پر طبع ہوا ہے لکھ کر چھپوا کر ممبرانِ اسمبلی اور دیگر سربرآوردہ مسلمانوں کے پاس بھیجا تھا۔ ۱۳ محرم ۵۰ھ میں لکھا گیا۔

(۲۰) فضائل تبلیغ (مطبوع)

یہ بھی چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے تعمیل ارشاد میں لکھی گئی اور چند روز میں ۵ صفر شب دوشنبہ ۵۰ھ میں پوری ہوئی۔

(۲۱) الکوکب الدری (مطبوع)

یہ قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کی ترمذی شریف کی تقریر ہے جس کو میرے والد صاحبؒ نے پڑھنے کے زمانہ میں عربی میں لکھا تھا اور مشائخ درس بہت کثرت سے اس کی نقلیں بہت گراں قیمت سے طلباء سے کراتے رہے۔ نقلیں تو اس کی بہت ہوئی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت میاں صاحب مولانا الحاج اصغر حسین صاحب دیوبندی نے پچھتر (۷۵) روپے میں نقل کرائی تھی۔ میں نے اس کی نقل دینے میں کبھی بخل نہیں کیا، اگرچہ بہت سے لوگوں نے مجھے بہت ہی منع کیا، بالخصوص منطقی علماء نے اور بہت سے احباب کا شدید اصرار اس کی طباعت پر رہا بالخصوص حضرت مدنی قدس سرہٗ کا، مگر میرے ذہن میں یوں تھا کہ وہ مسودہ ہے علماء میں سے اتنے کوئی نظر ثانی اور مختصر حواشی اس پر نہ لکھے نہ طبع کرائی جائے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ اور مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ سے بار بار درخواست کی، بالخصوص مولانا مرحوم سے اس وجہ سے کہ انہوں نے ترمذی کی شرح لکھنی شروع کی تھی۔ لیکن مشاغل کی وجہ سے کوئی بھی راضی نہ ہوا۔

مجھے ۵۱ھ میں یہ معلوم ہوا کہ ایک صاحب نے اس کو بحالہ چھاپنا شروع کر دیا ہے اور کئی جز چھاپ بھی لئے، جس پر مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ غلط چھپ جائے گی، اس لئے اوجز کی تالیف چند سال کے لئے روک کر اس کا کام شروع کرنا پڑا اور جلد اول کے حواشی اور نظر ثانی سے وسط ربیع الاول ۵۲ھ میں فراغت ہوئی اور جلد ثانی سے ۱۶/ رجب/ ۵۳ھ میں فراغت ہوئی۔ ان ہی وجوہ سے اوجز کی تالیف میں دیر ہوتی چلی گئی۔

(۲۲) حکایات صحابہؓ (مطبوع)

صفر ۵۷ھ میں اجڑارے جاتے ہوئے میرٹھ میں نکسیر کا شدید حملہ ہوا جو مغرب کے بعد سے شروع ہوکر صبح کو آٹھ بجے تک مسلسل رہا اور تقریباً دو گھڑے کے قریب خون ساری رات نہ معلوم کہاں سے پیدا ہوا۔ اور نکسیر کی ابتداء بھی اپنی ایک حماقت سے جو حضرت مدنی قدس سرہٗ کی بے تکلفی کی بناء پر پیدا ہوئی تھی لمبا قصہ ہے۔

بہر حال علی الصباح یہ ناکارہ بجائے اجڑارے کے حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ فرسٹ کلاس ڈاکٹروں اور حکیموں کی طرف سے چند ماہ تک دماغی کام سے روک دیا گیا۔

میرے حضرت میرے مربی میرے محسن حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کا ارشاد تقریباً چار برس سے اس کی تالیف کا ہو رہا تھا۔ مگر اپنے مشاغل کے ہجوم کی وجہ سے تعمیل کا وقت نہ ملا، اس بیماری کے زمانے کو غنیمت سمجھ کر تعمیلِ ارشاد میں پڑے پڑے کچھ لکھتا رہا۔ اور ۱۲/ شوال ۵۷ھ کو پوری ہوگئی کہ کچھ دنوں بعد سبق کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا اور اسی کے ساتھ اعتدال کی تالیف بھی شروع ہوگئی تھی جو آگے آرہی ہے۔

(۲۳) الاعتدال فی مراتب الرجال (مطبوع)

۵۶ھ اور اوائل ۵۷ھ کانگریس اور لیگ کے اختلافات نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ اکابر کی شان میں بے حد گستاخیاں اور بے ادبیاں ہوئیں اور بعض لوگوں نے دوسرے خیال کے امام کو فرائض جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں مصلّے سے بھی ہٹا دیا اور جس جگہ جس فریق کا غلبہ ہوا اس جگہ دوسرے خیال کے مُردوں کو قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا۔

اس سیہ کار کے پاس اس زمانے میں خطوط کی بڑی بھرمار تھی۔ علیحدہ علیحدہ جواب دینا مشکل تھا، اس کے باوجود لکھنا پڑتا تھا۔ ایک عزیز نے میرے بہت سے خطوط جمع کر کے سب اشکالات کو ایک خط کی صورت میں لکھ کر اس کے جواب کا مطالبہ کیا۔ میں نے بھی علیحدہ علیحدہ جواب لکھنے سے اس کو آسان سمجھا کہ ایک کاپی پر اس کو مفصل نقل کرالیا اور ۲۹ شعبان ۵۷ھ کو یہ جواب ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ہر شخص کو مختصر جواب لکھنے کے بعد یہ لکھتا ”تفصیلی گفتگو زبانی ہوگی، یہاں آجاؤ“۔ یہاں آنے پر اس کو کاپی دکھا دیتا۔

اتفاق سے میرے چچا جان اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہما کو اس کا علم ہوگیا، دونوں نے بہت اصرار اس کی اشاعت کا کیا، بلکہ حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے تو میر آل علی صاحب کو حکم دیا کہ وہ اور شاہ مسعود حسن صاحب مل کر اس کو طبع کرادیں، جس پر میں نے یہ کہہ کر شدت سے انکار کردیا کہ ”حضرت کسی دوسرے کے طبع

کرانے کی ضرورت نہیں میں اس کو عوام میں پھیلانا نہیں چاہتا، مخصوص کو دکھاتا ہوں''۔ اور پھر ان دونوں بزرگوں کی تعمیل ارشاد مین چند روز میں اس کو طبع کرالیا۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ نے طبع کے بعد بہت پسند فرمایا اور ہمیشہ سفری بیگ میں اس کا نسخہ رکھا رہتا تھا۔ ان ہی بزرگوں کی برکت کا اثر تھا کہ یہ کتاب اندازہ سے زائد مقبول ہوئی، سنجیدہ طبقہ اور علماء نے بہت پسند کیا، بیس پچیس مطابع میں ہندو پاک کے کئی کئی مرتبہ طبع ہوئی اور گزشتہ سال اس کے نمبر ۴ کا ترجمہ عزیزم مولوی عبدالرحیم متالا نے گجراتی میں کر کے ''درد اور دوا'' کے نام سے شائع کرایا اور اس سال بمبئی کے احباب کے تقاضوں پر اس نمبر کو ''مسلمانوں کی پریشانیوں کا بہترین علاج'' کے نام سے اردو میں ۲۵ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ کو شائع کرایا گیا۔

(۲۴) مقدمات کتب حدیث (غیر مطبوع)

اس ناکارہ نے مختلف ایام میں ۴۶ھ سے ۵۶ھ تک کے دوران ''ایک مقدمہ علم الحدیث'' لکھا تھا۔ جو ''مقدمہ اوجز'' میں طبع ہوگیا۔ اس کے علاوہ سب کتابوں کا ''مقدمۃ الکتاب'' بھی لکھا، جس میں اس کتاب کی خصوصیات، مصنف اور اس کے حالات اس کتاب کے مناسب جو چیزیں تھیں، ان میں سے ''مقدمۃ البخاری'' بہت سے اضافوں کے ساتھ ''مقدمۂ لامع'' میں چھپ چکا ہے۔

مقدمۂ بذل المجہود ابوداؤد بہت مفصل لکھا تھا اور بذل المجہود کے شروع میں اس کی طباعت کا بھی ارادہ تھا۔ مگر حضرت قدس سرہٗ نے خود اس کا مقدمہ مختصر لکھوادیا۔ مجھے یہ عرض کرتے ہوئے شرم آئی کہ میں نے مفصل لکھ رکھا ہے، اس لئے طباعت کی نوبت نہ آئی۔

اسی طرح بقیہ کتب ستہ کی نیز شمائل ترمذی و نیز طحاوی وغیرہ کے مقدمۃ الکتب لکھے ہوئے میری الماری میں موجود ہے۔

(۲۵) فضائل نماز (مطبوعہ متعدد بار)

چچا جان کے تعمیل ارشاد میں لکھا گیا اور ۷ محرم ۵۸ھ شب دوشنبہ میں پورا ہوا۔

(۲۶) فضائل ذکر (مطبوعہ متعدد بار)

یہ بھی چچا جان قدس سرہٗ کے تعمیل ارشاد میں لکھا گیا اور ۲۶ شوال ۵۸ھ شب جمعہ میں پورا ہوا۔

(۲۷) فضائل حج (مطبوعہ متعدد بار)

عزیز مولانا یوسف مرحوم نے جب حجاج کا کام شدت سے شروع کیا تو مجھ پر

تتمہ کیا کہ فضائل حج میں ایک رسالہ ضرور لکھ دوں۔

۳ شوال ۶۶ھ کو اس کی ابتداء ہوئی اور ۱۴ جمادی الاول ۶۷ھ بروز جمعرات فراغت ہوئی۔ نفس رسالہ سے تو فراغت شوال ہی میں ہوگئی تھی۔ پس کچھ حکایات کا اضافہ سہارنپور واپسی پر ہوا۔

اس رسالہ کی متعلق ایک خواب۔ میرا تو جیہ نہ چاہتا تھا کہ لکھواؤں مگر بعض دوستوں کا جو اس وقت مسودہ لکھوانے کے وقت موجود تھے اصرار ہے کہ ضرور لکھواؤں۔

جب یہ رسالہ لکھا جارہا تھا تو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے ایک مخلص خادم ذاکر وشاغل نہایت متقی بزرگ نے ایک خواب دیکھا کہ حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور یہ ناکارہ دونوں مل کر بیت اللہ شریف کی تعمیر کررہے ہیں۔ انہوں نے حضرتؒ سے خواب عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا ''شیخ کو لکھدو''۔ انہوں نے مجھے لکھا۔ اس ناکارہ نے جواب میں لکھا کہ ''تعبیر صاف ہے، اس ناکارہ نے ایک رسالہ فضائل حج میں لکھا ہے جو آج کل زیر طبع ہے، انشاء اللہ یہ رسالہ بیت اللہ شریف کی تعمیر روحانی میں معین ہوگا''۔ چنانچہ ہزاروں خطوط اس نوع کے پہنچے کہ اس رسالہ سے حج وزیارت میں بہت لطف آیا۔

(۲۸) فضائل صدقات (مطبوع)

چچا جان نوراللہ مرقدہٗ نے اپنی علالت کے زمانہ میں بار بار دو رسالوں کی تاکید فرمائی تھی، ایک فضائل زکوٰۃ اور ایک فضائل تجارت حتی کہ ایک دن عصر کی نماز کی تکبیر ہورہی تھی تو صف میں سے آگے منہ نکال کر کہا ''دونوں رسالوں کو یاد رکھنا بھولنا نہیں''۔ مگر جیسا کہ فضائل حج اور فضائل صدقات کی تمہید میں تفصیل سے لکھا گیا۔ شوال ۶۶ھ میں ۴۷ء کے ہنگامہ کی وجہ سے چار ماہ سے زائد نظام الدین میں محبوس رہنا پڑا۔ لہٰذا فضائل حج کے ختم ہونے کے بعد اسی قیامت کے یاد دلانے والے ہنگامے میں نظام الدین میں اس کی ابتداء ہوئی اور سہارنپور واپسی کے بعد ۲۲ صفر ۶۸ھ کو ختم ہوئی۔

(۲۹) لامع الدراری تین جلد (مطبوعہ)

اوجز کی فراغت کے بعد جیسا کہ لامع کے شروع اور خاتمہ پر لکھا گیا ہے کہ ۷ محرم ۱۳۷۶ھ یوم چہارشنبہ کو اس کو ابتداء ہوئی اور ۱۰ ربیع الاول ۸۸ھ کو کتاب مکمل ہوئی۔ اور چونکہ اپنے ضعف اور امراض کی کثرت کی وجہ سے تالیف حدیث کے سلسلے کو ختم سمجھ رہا تھا اس لئے ۱۷ ربیع الاول ۸۸ھ مطابق ۱۴ جون ۶۸ء کو اس کے اختتام کی ایک دعوت کی، جو

شروع میں تو بہت مختصر مدرسہ کے مدرسین اور مخصوص احباب، سوڈیڑھ سو کا اندازہ تھا، مگر نہ معلوم کس طرح اس کی ایسی شہرت عام ہوئی کہ دہلی، لکھنو، کلکتہ، بمبئی تک خبریں پہنچ گئیں اور تقریباً ایک ہزار کا مجمع جمعہ کی شب اور صبح تک جمع ہو گیا۔ برابر دیگیں بڑھتی رہیں اور پلاؤ زردہ مولوی نصیر الدین، شیخ انعام اللہ، شیخ اظہار وغیرہ کی مساعی جمیلہ سے بہت جلد تیار ہوتا رہا، اور اس غلط شہرت سے کہ آج عزیزان زبیر و شاہد کا نکاح ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی تذکرہ یہاں نہیں تھا۔ مقامی و بیرونی عورتوں کا مجمع بھی گھر میں بہت ہو گیا تھا۔

(۳۰) فضائل درود شریف (مطبوع)

اس کی تالیف بھی حضرت شاہ یٰسین صاحب نگینوی کی وصیت کے موافق ہے، حضرت شاہ صاحب کا وصال ۳۰ شوال ۶۰ھ شب پنجشنبہ میں ہوا تھا۔ اور انہوں نے وصال کے وقت اپنے مخلص خادم اور اجل خلفاء عبدالعزیز صاحب دہلوی دعا جو کہ یہ وصیت کی تھی کہ ''زکریا سے کہہ دیجیو کہ جس طرح تو نے فضائل قرآن لکھی ہے، میرے کہنے سے فضائل درود بھی لکھ دے''۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے وصال کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم بار بار زبانی اور تحریری تقاضے شدت سے کرتے رہے۔ مگر بداعمالیوں نے مہلت نہ دی، لیکن ۸۳ھ کے حج میں مدینہ پاک حاضری پر شدت سے اس کا تقاضا شروع ہوا، واپسی پر بھی تساہل ہوتا رہا اور ۲۵ رمضان ۸۴ھ کو بسم اللہ کر ہی دی اور ۶ ذی الحجہ ۸۴ھ کو دفعۃً ختم کر دی کہ عزیزی مولوی یوسف مرحوم کے انتقال کے تار آنے پر اپنی زندگی سے کچھ ایسی مایوسی ہوئی کہ جتنی لکھی تھی اسی پر ختم کر دی۔

(۳۱) رسالہ اسٹرائک (مطبوعہ)

مدارس عربیہ میں اسٹرائک کی روز افزوں وبا سے جتنی نفرت اس سیہ کار کو ہے اتنی شاید ہی کسی کو ہو اور اس میں میرے دو بزرگ حضرت تھانوی اور حضرت مدنی نور اللہ مرقدہما بھی بہت مخالف تھے۔ روز افزوں اسٹرائک کی مصیبت کی وجہ سے یہ رسالہ ۱۲ ربیع الاول ۸۸ھ کو لکھا گیا، جس میں اکابر مذکورین کے ارشادات بھی نقل کیے گئے۔

(۳۲) رسالہ آپ بیتی (مطبوعہ)

عزیز مولوی محمد ثانی سلمہ نے عزیز مولانا محمد یوسف مرحوم کی سوانح عمری لکھی اور اس میں ایک باب علی میاں نے عزیز یوسف کے مشائخ میں اس سیہ کار کا بھی اپنے قلم سے لکھ دیا۔

میں نے علی میاں کو لکھا کہ ''جو باتیں لکھنے کی تھیں وہ تو آپ نے لکھی نہیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں''۔ اس پر ایک مضمون ان کو لکھا اور احباب کے اصرار پر اس میں کچھ اضافہ کے ساتھ ۱۵ ربیع الثانی ۸۸ھ کو آپ بیتی کے نام سے ایک رسالہ شائع کر دیا۔ یہ رسالہ جواب لکھوا رہا ہوں اسی کا دوسرا حصہ ہے، کل چھ حصے طبع ہو چکے ہیں۔

(۳۳) اصول حدیث علی مذهب الحنفیه (غیر مطبوعه)

مسلکِ حنفیہ پر اصول حدیث کا ایک متن جو ۸ جمادی الاول ۴۲ھ کو شروع کیا تھا اور ۱۰ جمادی الاول کو ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس پر حواشی کا سلسلہ ۸۸ھ تک چلتا رہا، جو مضمون ذہن میں آتا اس کو لکھتا رہا۔

(۳۴) الوقائع والدهور (غیر مطبوعه)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور اس کے بعد خلفائے راشدین اور اس کے بعد سلاطینِ بنی امیہ وغیرہم کے حالات۔ جلد اول میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے، جلد ثانی میں خلفاء راشدین کے اور جلد ثالث میں ان کے بعد والوں کے۔ ۲۵ محرم ۴۲ھ یوم جمعہ کو ابتداء کی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک جو نیا واقعہ ملتا رہا اس سال کی جلد میں نکال کر لکھتا رہا۔ اس کا سلسلہ ۸۸ھ تک چلتا رہا۔

(۳۵) المؤلفات والمؤلفین (غیر مطبوعه)

معروف کتب حدیث وفقہ اور معروف مؤلفین کے حالات اور ان کے احوال کے مواضع جن جن کتابوں میں تھے، ان کے حوالے، اس کی ابتداء یکم جمادی الثانی ۴۷ھ کو ہوئی تھی۔ ۸۸ھ تک اس کا سلسلہ چلتا رہا۔ ۸۸ھ اس ناکارہ کے علمی انہماک کا گویا خاتمہ ہے کہ آنکھوں نے بھی بالکل جواب دے دیا اور دماغ اور قویٰ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اب تو

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم!

(۳۶) تلخیص المؤلفات والمؤلفین (غیر مطبوعه)

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں مؤلفین کے نام اور بہت مختصر سوالات جمع کئے گئے اور تفصیل کے لئے رسالہ بالا کا حوالہ لکھ دیا۔

(۳۷) جُزء المعراج (غیر مطبوعہ)

نبی کریم ﷺ کے معراج شریف کے متعلق ایک مستقل رسالہ لکھنا شروع کیا تھا، جس کے کئی جز تو ہو گئے مگر تکمیل کو نہیں پہنچا۔

(۳۸) جز وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم (غیر مطبوعہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الوصال کی ابتداء، دن اور تاریخ، ازواج مطہرات کے یہاں دورہ اور اخیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یہاں تشریف آوری اور مرض کی شدت وغیرہ احوال کی روایات جمع کی گئیں مگر افسوس مکمل نہ ہوسکا۔

(۳۹) جزء افضل الاعمال (غیر مطبوعہ)

افضل الاعمال کے بارے میں روایات بہت مختلف وارد ہیں اس لئے میں نے اس رسالہ میں ان سب روایات کو جمع کیا اور مشائخ نے ان میں جمع کے متعلق جو توجیہات کیں ان میں سے بھی اکثر نقل کی ہیں مگر رسالہ پورا نہ ہوسکا۔

(۴۰) جزء روایت الاستحاضہ غیر مطبوعہ

استحاضہ کی روایات میں جو تعارض ہے وہ حدیث پڑھنے پڑھانے والوں سے مخفی نہیں۔ میرے حضرت قدس سرہٗ اعلیٰ اللہ مراتبہ نے بذل المجہود کا باب الاستحاضہ لکھوانے کے بعد یوں ارشاد فرمایا تھا کہ استحاضہ کے ابواب میں ہمیشہ ہی اشکال رہا۔ خیال تھا کہ بذل المجہود میں سمجھ میں آجائیں گے مگر اس میں بھی سمجھ میں نہیں آئے اور سچ فرمایا۔ کوکب لکھی، اوجز لکھی، لامع لکھی، لیکن پھر بھی حل نہ ہوئے۔ چنانچہ کوکب کے حاشیہ پر حمنہ بنت جحش کے قصہ میں بندہ نے اپنی ایک خاص رائے لکھی ہے جو سارے مشائخ اور شراح کی رائے کے خلاف ہے۔ میرے حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ ایک دفعہ دیوبند سے صرف اس حدیث کی وجہ سے تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ ''صرف اس حدیث کی وجہ سے آیا ہوں، تم نے بات بہت معقول لکھی، مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کو یہ الہام سارے مشائخ سارے شراح کے خلاف کہاں سے ہوا، آپ کے حضرت نے بذل المجہود میں وہی لکھا جو سارے شراح لکھ رہے ہیں، ملا علی قاری شراح ترمذی سب ایک مضمون پر متفق ہیں، مگر آپ نے نیا مطلب کہاں سے نکالا، کوئی مستند اس کا آپ کے پاس ہے؟'' میں نے عرض کیا، مشکل الآثار طحاوی سے یہی مطلب مستنبط ہوتا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا، پھر تو بڑا قوی ماخذ ہے اور مشکل الآثار نکلوا کر دیکھی۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کوکب اور لامع کو قطب عالم

حضرت گنگوہی کی وجہ سے اہتمام سے دیکھا کرتے تھے اور لوگوں کو ترغیب بھی دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بلکہ کئی دفعہ حضرت نے فرمایا، ''آپ نے کوکب کا حاشیہ لکھا یا ہے، اوجز کا استحضار دیا ہے، ہر مسئلہ میں والبسط فی الاوجز لکھتے ہیں، ایک دفعہ یہاں دیکھو، ایک دفعہ وہاں''۔

حدیث پاک میں چونکہ اس ناکارہ کی مرغے کی ایک ٹانگ بہت سی جگہ الگ ہوتی، اس لئے میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ ان پر اکثر مراجعت فرمایا کرتے تھے۔ صلی اللہ مراتبہ''.

(۴۱) جزء رفع الیدین (غیر مطبوعہ)

رفع الیدین مشہور مسئلہ ہے، اس ناکارہ نے ان سب روایات کو ایک جگہ جمع کیا اور ان پر تفصیلی کلام کا بھی ارادہ تھا، مگر مقدر سے پورا نہ ہوسکا۔

(۴۲) جزء الاعمال بالنیات (غیر مطبوعہ)

یہ تو بڑی جامع حدیث ہے اور بہت سے مسائل اس سے ثابت ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کی ابتداء بھی اسی حدیث سے کی گئی ہے۔ جس میں نمونے کے طور پر کچھ ذکر کیا گیا ہے۔

اپنی زندگی کے زمانہ میں اس حدیث پر بھی بڑا تفصیلی کلام شروع کیا تھا، کچھ لکھا بھی مگر پورا نہ ہوسکا۔

(۴۳) جزء اختلافات الصلوٰۃ (غیر مطبوعہ)

مشکوٰۃ شریف پڑھانے کے زمانے میں میری تقریر کا خلاصہ یہ رہا کہ رفع یدین، فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، وغیرہ تین چار مسائل کی کیا خصوصیت ہے کہ جس پر یہ معرکے، مناظرے، مجادلے، ہر جگہ ہوتے رہتے ہیں۔ اختلاف یہ ہے کہ رفع یدین سنت ہے یا عدم رفع، اسی طرح سے آمین بالجہر وغیرہ میں اسی نوع کے اختلاف ہیں۔ اس کے لئے میں نے نماز کی چار رکعتوں کے اختلاف جمع کرنے شروع کئے تھے۔ اس وقت دوسو سے زائد ہوگئے تھے، بعد میں ان پر اور اضافے بھی ہوئے۔

میں حدیث کے اسباق میں اولاً تو اجمالاً اسی فہرست سے یہ بیان کیا کرتا تھا کہ ان چار میں کیا خصوصیت ہے کہ یہ اعتقادیات کے درجہ میں ہوگئے، اور اس کے بعد اسی رسالہ کی مدد سے ہر باب میں اس باب کے اختلافی مسائل کی تفصیل بیان کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد سے اس میں کچھ اضافہ بھی ہوتا رہا۔

(٤٤) جزء اسباب اختلاف الائمہ (غیر مطبوعہ):

لے مظاہر علوم سے ایک رسالہ ''المظاہر'' کے نام سے مفتی جمیل احمد صاحب کی زیر ادارت نکلنا شروع ہوا تھا، اس میں اس ناکارہ کا ایک مضمون اس سلسلے کا شروع ہوا تھا کہ ''ائمہ اربعہ میں اتنا وسیع اختلاف کیوں ہے جب کہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اقوال وافعال ہی سے استدلال کرتے ہیں''۔

اس رسالے کے مختلف پرچوں میں تقریباً اسی (۸۰) صفحے اس مضمون کے شائع ہو چکے تھے، اس کے بعد مضمون تو اور بھی لکھا ہوا تھا مگر رسالہ ''المظاہر'' بند ہو گیا اور وہ شائع نہ ہو سکا۔ بیسویں احباب کے خطوط اس زمانہ میں آئے کہ ہم نے یہ رسالہ تیرے مضمون کی وجہ سے شروع کیا تھا، اگر یہ مضمون کسی اور رسالہ میں شروع ہو رہا ہو تو اس کا پتہ لکھ دیں، ورنہ اس کو ایک مستقل رسالہ میں شائع کر دیں۔

(٤٥) جزء المبہمات فی الاسانید والروایات (غیر مطبوعہ:)

احادیث کی اسانید میں بھی اور روایات میں بھی بہت سے نام مبہم آتے ہیں، اس ناکارہ نے ان سب کے نام دوسری احادیث سے تلاش کر کے لکھنے شروع کئے تھے اور اچھا خاصا ذخیرہ ہو گیا تھا، ان میں ان مبہمات کو چھوڑ دیا گیا جو تہذیب، تقریب، تعجیل وغیرہ میں آ گئے ہیں۔

(٤٦) رسالہ التقدیر (غیر مطبوعہ:)

ایک زمانے میں یہ مضمون رات دن دماغ میں چکر کھاتا تھا کہ آدمی کے مقدر میں جتنا ہوتا ہے اس سے زائد نہیں ملتا اور نہ اس سے کم ملتا ہے، مثلاً اگر کسی کے مقدر میں مرغیاں کھانا ہے وہ بہر حال مرغی کھائے گا۔ یا حضرت بن کر کھائے یا کما کر اپنے پیسوں کی کھائے یا لیڈر بن کر کھائے اور اگر کوئی ہنر بھی اس کے پاس نہیں تو وہ کسی رئیس یا اعلیٰ حاکم کا خانسامہ بنے گا۔ اس کی بہت سی جزئیات لکھی تھیں۔

جس کے مقدر میں جیل ہے وہ چوری یا ڈاکہ مار کر جیل میں جائے گا ورنہ سیاسی لیڈر بن کر جائے گا ہی، اکابر کے قصے بھی اس میں لکھے تھے۔ اور تعویذوں کی بدولت ہر آنے والے کے گھر کے حالات بھی پوچھ لیتا تھا کہ کیا آمد ہے؟ کیا کھاتے ہو؟ اور وہ یہ سمجھ کر تعویز میں اسکی بھی ضرورت ہے سب بتا دیتا تھا۔ بڑی اونچی تنخواہوں والے بیماری کی وجہ سے حکیم ڈاکٹروں نے سب کچھ منع کر رکھا ہے۔ ابلی ہوئی دال یا بغیر گھی کا سالن وغیرہ وغیرہ۔ بغیر نام کے بہت سے قصے اس میں جمع کئے تھے۔

جس کے مقدر میں موٹر کی سواری لکھی ہے، وہ ہزار بارہ سو کما کر اپنی موٹر خریدے توفیق الٰہی سے حضرت جی بن جائے یا لیڈر یا پھر ڈرائیور۔ اس رسالہ کے پورا کرنے کا مجھے بھی ہمیشہ اشتیاق رہا، مگر مقدر نہ ہوا۔ اس میں واقعات بہت عبرت انگیز لکھے ہوئے ہیں جو اس زمانہ کے اخبارات سے بھی نقل کئے تھے۔

(۴۷) سیرت صدیق (غیر مطبوعہ:)

یہ رسالہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سوانح میں رسالہ ''الصدیق'' والوں کے اصرار پر جو غالباً مظاہر علوم ہی سے نکلتا تھا، لکھنا شروع کیا تھا، مسودہ تو بہت سا ہو گیا تھا، لیکن طباعت کی نوبت شاید ایک ہی آدھ پرچہ میں آئی، پھر وہ پرچہ ہی بند ہو گیا تھا۔ اس وقت تو نہ پرچہ یاد ہے نہ غالباً کہیں ملے گا۔ جتنا یاد تھا اتنا لکھوا دیا۔

(۴۸) رسالہ فوائد حسینی (غیر مطبوعہ:)

حضرت اقدس سیدی وسندی شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ کی تشریف آوری پر بسا اوقات علمی تذکرہ بھی ہوتا رہتا تھا، اس میں جو مضامین عالیہ بندہ کے نزدیک قابل حفظ ہوتے تھے ان کو رسالہ میں جمع کرتا رہتا تھا، بڑے اچھے مضامین ہیں، مگر پورا ہونے کی اور طباعت کی نوبت نہیں آئی۔

ان کے علاوہ اجزاء اور رسائل تو بہت سے ناقص و کامل لکھے ہوئے ہیں مگر علی گڑھ کے قیام میں جتنے ذہن میں آئے اور یاد رہے وہ تو لکھوا دیئے، تاریخیں البتہ ان کی علی گڑھ میں چھڑا دی تھیں۔ وہ سہارنپور واپسی پر احباب نے اصل کتابوں سے دیکھ کر لکھ دیں، اس لئے کہ اس ناکارہ کو تو اب آنکھوں کی معذوری کی وجہ سے تلاش کرنا اور لکھنا مشکل ہے اسی وجہ سے بہت سے مسودات جو اس وقت یاد نہیں آئے رہ بھی گئے۔

اس کے بعد کاغذات میں سے عزیز عاقل سلمان اور مولانا یونس صاحب کو سرسری طور پر میرے جنگل میں سے جو ملے ان کو بھی نیچے درج کرا رہا ہوں۔

(۴۹) حواشی کلام پاک (غیر مطبوعہ:)

اسی تحریر میں کسی دوسری جگہ پر یہ گزر چکا ہے کہ اس ناکارہ کا معمول ۳۸ھ سے لے کر ۵۰ھ تک ماہ مبارک کی راتوں میں سونے کا نہیں تھا بغیر رمضان المبارک کے تو کلام مجید دیکھ کر پڑھنے کا وقت بہت ہی کم ملتا رہا، لیکن رمضان المبارک میں دو چار رمضانوں کے علاوہ تمام علمی کام سب بند ہو جاتے تھے اور قرآن پاک کے دیکھ کر پڑھنے کا معمول ماہ مبارک میں بہت

اہمتام سے ہوجاتا تھا۔ تراویح کے بعد سے تہجد کے وقت ترجمہ کے تدبر وتفکر کے ساتھ پڑھنے کی نوبت آتی تھی اوراس میں جواشکال پیش آتا تھا، اسی وقت تفاسیر سے مراجعت کر کے بین السطور کے حواشی پرلکھ لیتا۔ مگرافسوس کہ چار پانچ سال سے ان کے پڑھنے سے بھی معذور ہوں۔

(۵۰) حواشی الاشاعة (غیر مطبوعہ:)

الاشاعۃ فی اشراط الساعۃ طلب علم کے زمانہ سے میرے پاس تھی، اور میں نے اس کے ہردو (۲) ورق کے درمیان میں ایک سادہ ورق لگوا کر جلد بندھوا رکھی تھی اور ۳۵ھ تک وقتاً فوقتاً اس پر حواشی کا اندراج اس کی مندرجہ روایات کا حوالہ اور فتح الباری وغیرہ سے جو کلام صاحب اشاعہ نے نقل کیا اس پر فتح الباری وغیرہ کے صفحات نیز اس کا کوئی مضمون کسی دوسری جگہ ملا تو اپنے حواشی پر لکھ دیا۔

(۵۱) حواشی وذیل التہذیب (غیر مطبوعہ:)

حافظ ابن حجر کی تہذیب، تقریب، تعجیل وغیرہ پر حواشی تو سب ہی پر لکھتا رہا، لیکن تہذیب التہذیب پر کثرت سے لکھے گئے اور ذیل التہذیب کے نام سے مستقل بارہ جلدیں مجلد کرا کر تہذیب کے موافق اس پر صفحے ڈال دیئے تھے کہ اس پر تہذیب کا استدراک اور ذیل لکھا جائے، مگر تہذیب پر حواشی تو لکھنے کی زیادہ نوبت آئی مگر اس ذیل پر لکھنے کی نوبت کم آئی۔

(۵۲) حواشی اصول الشاشی، ھدایہ وغیرہ (غیر مطبوعہ:)

اصول الشاشی اس ناکارہ نے ابتداء ۳۵ھ میں پڑھائی، جیسا کہ تدریس کے نقشے میں گزر چکا ہے۔ اس کے بعد بھی ایک دو دفعہ پڑھانے کی نوبت آئی، اور ہدایہ ابتداء شوال ۳۷ھ میں پڑھایا تھا اور اس کے بعد بھی تین چار بار پڑھانے کی نوبت آئی۔ ہر دفعہ میں اس پر حواشی کا اضافہ ہوتا رہا۔ اس ناکارہ نے جتنی کتابیں بھی پڑھائیں وہ اپنی ذاتی کتابوں میں پڑھایا۔ مدرسہ کی کتاب میں کوئی کتاب نہیں پڑھائی اور چونکہ لکھنے کا مرض شروع ہی سے ہے، اس لئے میری ہر کتاب پر جو میں نے پڑھائی، قلیل وکثیر حواشی موجود ہیں۔

(۵۳) حواشی مسلسلات (غیر مطبوعہ:)

مسلسلات کی ۶۴ھ سے تو مخصوص طلباء دورہ حدیث کے بعد اجازت لیا کرتے

---

(۱) اب یہ رسالہ اختلاف ائمہ کے نام سے طبع ہوگیا ہے۔

تھے، لیکن ۵۳ھ سے وہ دورہ کے بعد ایک مستقل باضابطہ سبق بن گیا۔ اسی وقت سے بندہ نے اس کے حواشی بھی شروع کئے جو مسلسل بالصوفیہ میں آرہی تھیں۔ نقشہ بنا کر دوبارہ سہ بارہ طبع کرایا۔ حواشی کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی اور اس کے رجال پر مستقل کلام علیحدہ لکھا جس کو رجال المسلسلات کے نام سے موسوم کیا۔

(۵۴) جزء مکفرات الذنوب (غیر مطبوعہ:)

احادیثِ شریفہ میں جن جن اعمال کو کفارہ ذنوب بتایا ہے ان سب کا مجموعہ احادیث کو اختصاراً اجمالاً جمع کیا گیا ہے، تفصیل کا وقت نہیں ملا۔

(۵۵) جزء ملتقط المرقاة (غیر مطبوعہ:)

شوال ۴۱ھ میں جب پہلی مرتبہ مشکوٰۃ المصابیح مستقل پڑھانی شروع کی تو ۲۹/ ذی الحجہ یوم الاثنین سے اس رسالہ کی ابتداء کی۔ اس میں مرقاۃ کو دیکھتے ہوئے جو خصوصی قابل حفظ مضمون ہوتے تھے، ان کو شذرات کے طور پر جو نمبر ۹ میں گزرے نوٹ کرتا رہتا تھا۔

(۵۶) جزء ملتقط الرواة عن المرقاة (غیر مطبوعہ:)

یہ رسالہ بھی اسی زمانہ میں ذیقعدہ ۴۱ھ کے آخری جمعہ کو شروع کیا تھا، اس میں ان رواۃ کو جمع کیا تھا، جن پر ملا علی قاری نے مرقاۃ میں کلام کیا ہے۔ پہلے جُز کا التقاط ۲۹/ ذی الحجہ ۴۱ھ بروز دوشنبہ کو پورا ہوا۔

(۵۷) معجم المسند للامام احمد (غیر مطبوعہ:)

مسند امام احمد کی روایات ترتیب صحابہ پر ہیں جس میں حدیث کا تلاش کرنا بڑا مشکل ہے، اس رسالہ میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ان سب صحابہ کرامؓ کی روایات کی فہرست لکھی گئی ہے جس میں ہر صحابی کی احادیث مع جلد وصفحہ درج کی گئی ہے، بہت مفید رسالہ ہے، جس سے احادیث کا نکالنا بہت آسان ہے۔

(۵۸) جزء المناط (غیر مطبوعہ:)

احادیث میں مناط کا مسئلہ بہت اہم ہے اور ائمہ اربعین کے اختلافات کا زیادہ تر مدار مناط ہی پر ہے، جس میں تنقیح المناط اور تحقیق المناط اور تخریج المناط کے ابحاث اور فروع ذکر کئے گئے ہیں۔

(۵۹) رسالہ مجدّدین ملت (غیر مطبوعہ:)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ میری امت میں ہر صدی میں ایک مجدّد پیدا ہوگا۔ جس کے متعلق ہر زمانہ کے محققین نے اپنی اپنی تحقیق کے موافق اکابر امت میں جو مجدد کہے گئے ہیں ان کی فہرست لکھی ہے۔ اس رسالہ میں ان سب اکابر کے اقوال جو مختلف زمانوں میں مختلف اکابر نے لکھے ہیں، چودھویں صدی تک کے جمع کئے گئے ہیں۔

(٦٠) جزء صلوٰة الاستسقاء (غیر مطبوعہ)

(٦١) وجزء صلوٰة الخوت (غیر مطبوعہ)

(٦٢) وجزء صلوة الكسوف (غیر مطبوعہ)

ان تینوں مسئلوں میں روایت میں بھی اختلاف اور تواریخ میں بھی اختلاف ہے کہ ان تینوں نمازوں کی ابتداء کب ہوئی اور کتنی مرتبہ حضور ﷺ نے پڑھی، کہاں کہاں پڑھی؟

ان تینوں رسالوں میں تینوں نمازوں کی روایت بھی جمع کی گئی ہیں اور اپنی طرف سے بعض روایات کو ترجیح بھی دی گئی ہے جن کا خلاصہ اوجز میں بھی آ گیا ہے۔

(٦٣) جزء ماقال المحدثون فی الامام الاعظم (غیر مطبوعہ)

یہ کئی جز کا رسالہ ہے جس میں حضرات امام اعظمؒ کی شان میں ائمہ محدثین کے اقوال جرح وتعدیل اور ان پر کلام نقل کیا گیا ہے۔

(٦٤) جزء تخريج حديث عائشةؓ فی قصة بريرةؓ (غیر مطبوعہ)

حضرت عائشہؓ کی احادیث حضرت بریرہؓ کے قصہ میں مختلف وارد ہوئی ہیں۔ اس رسالہ میں ان سب کو جمع کیا گیا ہے تاکہ دیکھنے والے کو بیک نظر سب اختلافات معلوم ہو جائیں۔

(٦٥) تقرير نسائي شريف (غیر مطبوعہ)

یہ بہت مفصل تقریر ہے جو اس ناکارہ نے ۴ ربیع الثانی ۱۴۱ھ میں لکھنی شروع کی تھی اور ساعۃ مبارکہ آخر ساعت من یوم الجمعہ جمادی الثانی ۱۴۱ھ میں ختم ہوئی۔ اس

میں وہ تقریر بھی آگئی جو میں نے حضرت قدس سرہ سے پڑھنے کے زمانے میں نقل کی تھی اور میرے والد صاحب کی دو تقریریں جو انہوں نے اپنے حضرت گنگوہی قدس سرہ سے نقل کی تھیں، ان کے علاوہ حضرت امام نسائیؒ کے قال ابو عبدالرحمن کی شرح مفصل آگئی ہے۔ نیز اس کے لئے زہر الربیٰ اور سندھی علی النسائی بالاستیعاب دیکھی اور مدرسہ میں ابتداء میں احادیث کی کتابوں کے متعلق ہر کتاب کا ایک نسخہ برائے مدرس مخصوص ہوتا تھا اسی میں حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نے پڑھایا اور ان ہی میں حضرت سہارنپوری اور دیگر مدرسین نے پڑھایا۔ نسائی شریف کے اس نسخہ پر قلمی حواشی بھی بہت ہیں، ان میں سے ما یتعلق بالکتاب کو بھی بندہ نے اپنی اس تقریر میں جمع کر دیا ہے، اور دیگر اکابر کی تقریریں جو مجھے ملیں ان سے بھی ما یتعلق بالکتاب کو اس تقریر میں جمع کیا گیا ہے۔ اس تقریر کو اکثر مدرسین نے نسائی شریف پڑھانے کے زمانے میں نقل بھی کیا ہے۔

(۶۶) جزء امراء المدینه (غیر مطبوعه)

اکثر روایات میں امیرِ مدینہ کی عبارت سے واقعات نقل کئے گئے ہیں: قال امیر المدینه کذا. فعل امیر المدینه کذا ۔ اس رسالہ میں امراءِ مدینہ کے ناموں کی تعیین اور ان کے امارت کے زمانہ کی ابتداء وانتہا جمع کی گئی ہے تاکہ واقعات میں امیر کی تعیین ہو سکے۔

(۶۷) جزء طرقه المدینهؓ (غیر مطبوعه)

مدینہ منورہ سے مکہ کی طرف آنے کے لئے چار راستے مشہور و معروف ہیں، سلطانی، فرعی، غائر اور شرقی ۔ اس رسالہ میں ان چاروں راستوں کی تفصیل اور ان کے منازل ذکر کئے گئے ہیں اور ان کے مختصر حالات بھی افسوس کہ رسالہ حجۃ الوداع کی تالیف کے وقت یہ رسالہ مل نہ سکا بعد میں ملا ورنہ اس سے بہت مدد ملتی۔

(۶۸) جزء مایشکل علی الجارحین (غیر مطبوعه)

ائمۂ جرح وتعدیل کے کلام میں بعض رجال کے متعلق جارحین کے کلام پر کچھ اشکالات پیش آتے ہیں اس رسالے میں ان اشکالات کو جمع کیا ہے۔

(۶۹) جزء الجهاد (غیر مطبوعه)

جہاد کی تعریف، اس کے شرائط، امارت اور خلیفۂ شرعی کی شرائط بیان کئے گئے ہیں۔

(۷۰) جزء انکحته صلی اللہ علیہ وسلم (غیر مطبوعہ)

امہات المؤمنینؓ کے نکاحوں کی تفصیل اوران کے احوال، اوران عورتوں کا ذکر جن کے نکاح میں اختلاف ہے۔ اور جن عورتوں سے خطبہ ہوا مگر نکاح نہیں ہوا ان کی تفاصیل۔ اور آخر میں حضرت فاطمہؓ کے نکاح کا ذکر ہے۔

(۷۱) مشائخ تصوّف (غیر مطبوعہ)

اکابر صوفیہ کے مختصر حالات۔ یہ رسالہ مشائخ چشتیہ کے علاوہ ہے۔ وہ تو مشائخ چشت کے ساتھ مخصوص تھا اور اس میں معروف صوفیاء کے حالات درج ہیں۔

(۷۲) اوّلیات القیامۃ (غیر مطبوعہ)

اس رسالہ میں وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جن کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اول ما یسئل یا اول مایفعل) فرمایا جیسے" اول ما یحساب العبد یوم القیامہ الصلوۃ" اور" اول ما یقضی فی الدماء. اول الناس یقضی علیہ یوم القیامہ رجل استشہد الحدیث "وغیرہ وغیرہ۔

(۷۳) مختصات المشکوٰۃ (غیر مطبوعہ)

مرقات میں یا دوسری شروح میں جو مضامین مشکوۃ شریف کی کتاب کے حل سے تعلق رکھتے تھے وہ اس رسالہ میں جمع کئے گئے ہیں، یعنی جو مضامین احادیث سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس میں نہیں لئے گئے، بلکہ خاص وہ مضامین جو نفس کتاب سے متعلق ہیں، ان کو جمع کیا گیا ہے۔

(۷۴) رسالہ رد مودودیت

۷۰ھ میں مودودیت کی کتابیں بہت ہی کثرت سے پڑھنے کی نبوت آئی۔ تقریباً تین رسائل اور کتب مودودی صاحب اوران کی جماعت کی شب وروز جاگ کر پڑھیں اور یادداشتیں ایک رسالہ کی صورت میں جمع کی تھیں اور یہی رسالہ حضرت مدنی قدسرہ' کی اکثر تالیفات کا بھی مأخذ ہے اور قاری سعید صاحب کی تالیف "کشفِ حقیقت" کا بھی مأخذ ہے اوراس ناکارہ نے تقریباً پچاس بڑی تقطیع کے صفحات پر خود بھی ایک رسالہ لکھا تھا، باوجود اکابر اور احباب کے شدید اصرار کے طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ یہ رسالہ میرے مسوّدات میں موجود ہے۔ بھائی اکرام کے ہاتھ کا نقل کیا ہوا ہے۔

(۷۵) مشرقی کا اسلام (غیر مطبوعہ)

عنایت اللہ مشرقی کا تذکرہ اور اس کی کتابوں کو بھی ایک زمانے میں بہت کثرت سے دیکھا اور اس کی کفریات کو ایک رسالہ میں جمع کیا یہی رسالہ قاری سعید صاحب مفتی مظاہر علوم کے رسالہ مشرقی کا اسلام مطبوعہ کا ماٰخذ ہے۔

(۷۶) میری محسن کتابیں

مولانا الحاج ابوالحسن علی ندوی نے ایک زمانہ میں اخبارات میں اس عنوان پر مضامین لکھوانے کا تقاضا کیا تھا اور اس ناکارہ پر تحریراً وتقریراً کئی دفعہ تقاضا کیا، اس پر اس ناکارہ نے زبانی تو یوں کہا تھا کہ ''میری محسن کتابیں تو ابا جان کا جوت تھا'' لیکن ان کے اصرار پر ایک رسالہ اس سلسلے میں بھی تصنیف کرنا شروع کیا تھا، جس میں ہر دور کی اپنی پسندیدہ کتابیں لکھی تھیں، مضمون ناقص رہ گیا پورا نہ ہوسکا۔

(۷۷) نظام مظاہر علوم

مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ جب مظاہر علوم کے ابتداءً سرپرست بنے تو انہوں نے مدرسہ کے سابقہ نظام کے متعلق تحریراً اور تقریراً بہت ہی معلومات دریافت کیں، اس کے جواب میں اس ناکارہ نے یہ بہت ہی اہم رسالہ لکھا تھا، جس میں میرے کئی ماہ تتبع اور تلاش میں بھی خرچ ہوئے تھے۔ بہت بڑی تقطیع کے تقریباً سو صفحے سے زائد تھے لیکن افسوس کہ اس سال مولانا مرحوم اوّلاً حجاز اور وہیں سے پاکستان تشریف لے گئے۔

اس رسالہ کے متعلق پاکستان پہنچنے کے بعد میں نے استفسار کیا تو مولانا مرحوم نے لکھا ''مجھے یاد نہیں وہیں متروکات میں رہ گیا ہوگا''۔ مولانا ظہور الحسن صاحب مقیم خانقاہ اشرفیہ اور مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم نائب مہتمم مظاہر علوم سے بھی دریافت کیا کہ شاید ان کے پاس ہو، نہ ملا۔

اس کی نقل میرے کاغزات میں بھی نہایت باریک میرے قلم کی لکھی ہوئی ہے، مگر وہ نمی کی وجہ سے ایک دوسرے سے چپک گئے۔ مظاہر علوم کی نہایت مستند بہترین ابتدائی تاریخ تھی جس کا مجھے بھی بے حد قلق ہے۔

مولانا شبیر علی صاحب ۲۳ ربیع الثانی ۲۳ھ میں سرپرست مقرر ہوئے اور شوال ۲۳ھ میں حج کو گئے اور وہاں سے مستقل پاکستان چلے گئے، اور شب سہ شنبہ ۲۸ رجب ۸۸ھ کو انتقال ہوگیا رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

(۷۸) جامع الروایات والاجزاء (غیر مطبوعہ)

اس ناکارہ نے اپنی ابتداء زندگی میں جس کو میں ۳۵ھ کے بعد سے شروع سمجھتا ہوں اور ۸۸ھ پر ختم سمجھتا ہوں۔ کتبِ احادیث کے اطراف لکھنے شروع کیے تھے جن کی روایات کو جامع الروایات کے نام سے جمع کرنا شروع کی تھی اور ان کی تفاصیل کو اجزاء کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا، اور اس میں صحاح ستہ، موطئین، طحاوی، حاکم، بیہقی وغیرہ کے اطراف لکھنا شروع کیے تھے، بہت بڑا ذخیرہ اس کا ہو چکا تھا جس کو مشکوٰۃ کی ترتیب سے شروع کیا تھا۔ مشکوٰۃ تو پوری ہوگئی تھی، خیال تھا کہ جملہ حدیث کی کتابوں کو بھی نقل کروں، لیکن پھر زندگی ختم ہوگئی اس لئے اس کی تالیف ناقص رہ گئی۔ کاش کہ کوئی پوری کرنے والا ہوتا!

(۷۹) معجم رجال تذکرۃ الحفاظ للذہبی (غیر مطبوعہ)

تذکرۃ الحفاظ چار جلدوں میں طبع ہوئی ہے اور ہر جلد کی فہرست الگ ہے اور اس میں بھی مشہور لقب اور کنیت سے رواۃ کو ذکر کیا گیا ہے، اس ناکارہ نے اس رسالے میں چاروں جلدوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی جس میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ناموں کی فہرست لکھی تھی اور ہر نام کو اس کے نام کے اعتبار سے اسی کے حرف میں لکھا تھا۔

(۸۰) تبویت تاویل مختلف الاحادیث لابن قتیبۃ (غیر مطبوعہ)

ابن قتیبہ کی ''تاویل حدیث'' مشہور کتاب ہے مگر مبوّب نہیں ہے کیف ما اتفق احادیث کو جمع کر دیا ہے۔ اس ناکارہ نے ابوابِ فقہیہ کی ترتیب پر اس کی تبویب کی تھی جو ۵ جمادی الاول ۴۳ھ جمعہ میں لکھی گئی۔

(۸۱) تبویب مشکل الاثار (غیر مطبوعہ)

امام طحاویؒ کی مشکل الآثار چار جلدوں میں ہے، اور اس کی فہرست بھی مسلسل مضامین کے اعتبار سے غیر مرتب ہے۔ اس ناکارہ نے ان چار جلدوں کی فہرست کو ابوابِ فقہیہ کے اعتبار سے مرتب کیا تھا۔

(۸۲) معجم الصحابۃ التی اخرج عنہم

ابو داؤد الطیاسی فی مسندہ (غیر مطبوعہ)

امام ابوداؤد طیاسی نے بھی مسندِ احمد کی طرح صحابہ کی روایات صحابہ کرامؓ کی مراتب کے اعتبار سے نقل کی تھیں جس سے وہی فائدہ اٹھا سکتا تھا جو مراتب صحابہ سے

واقف ہو۔اس ناکارہ نے ان سب صحابۂ کرامؓ کی روایات کی فہرست حروفِ تہجی کے اعتبار سے جمع کی۔

(۸۳) تبویت احکام القرآن للجصاص

امام ابوبکر جصاص رازی قدس سرہ کی ''احکام القرآن'' کی فہرست قرآن پاک کی ترتیب کے موافق ہے، اس سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو حافظ قرآن ہو، اس لئے اس کے مضامین کو علیٰ ترتیب ابواب الفقہیہ مرتب کیا گیا ہے۔

یہاں تک ختم کرنے کے بعد یہ باب تالیف کا ختم کرتا ہوں۔اب تک ان ہی رسائل واجزاء کا پتہ چلا ہے، میرے اندازے میں پچیس تیس ابھی اور بھی ہیں، لیکن اپنی فضیلت کے اظہار کے واسطے اتنے بھی کافی ہیں، اللہ تعالیٰ اس ریاکاری کو معاف فرمائے، آج ۱۵ شعبان کو یہ نمبر ختم ہو رہا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آئندہ نمبر اور ابواب آج کے بعد لکھے جائیں گے، یہ تو شروع میں لکھوا چکا ہوں کہ علی گڑھ کے قیام میں آٹھ بابوں کا اتصالی خاکہ اور بہت سے مضامین تفصیل سے پورے ہو گئے تھے۔چنانچہ باب سوم و چہارم بھی وہیں مکمل ہو چکے تھے اور بقیہ نمبروں کو بھی کچھ نہ کچھ لکھا جا چکا تھا، سہولت اور آپ بیتی نمبر ا کی رعایت سے بقیہ نمبروں کو بھی مختصر کرنے کا خیال ہے۔